فیض احمد فیض بطور شخص: فیض کی منتخب سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

سید تصدق حسین

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۱ء

فیض احمد فیض بطور شخص: فیض کی منتخب سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار:

سید تصدق حسین

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: فیض احمد فیض بطور شخص: فیض کی منتخب سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ

پیش کار: سید تصدق حسین رجسٹریشن نمبر:۱۷۲۶/S19/U/M

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز _____

پرو ریکٹر

بریگیڈیئر سید نادر علی _____

ڈایریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرارنامہ

میں سید تصدق حسین حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے پروفیسر روبینہ شہناز کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

سید تصدق حسین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	II
اقرار نامہ	III
فہرستِ ابواب	IV
Abstract	VII
اظہارِ تشکّر	VIII
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	
الف۔ تمہید	
i۔ موضوع کا تعارف	9
Ii۔ بیان مسئلہ	9
iii۔ مقاصد تحقیق	9
Iv۔ تحقیقی سوالات	10
v۔ نظری دائرہ کار	10
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	11
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	11
viii۔ تحدید	11
ix۔ پس منظری مطالعہ	11
x۔ تحقیق کی اہمیت	12
ب۔ تقابل کیا ہے؟	
ا۔ تقابل کا طریقہ کار	14

۲۔ تقابل کی اقسام و روایت 15
ہ۔ فیض احمد فیض، تعارف 19
حوالہ جات 25

باب دوم: سوانح نگاری کا فن، اصول اور روایت

۱۔ سوانح نگاری کیا ہے 26
۲۔ سوانح کی اقسام 29
۳۔ سوانح نگاری کے اصول و لوازمات 30
۴۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت کا مختصر جائزہ 34
حوالہ جات 44

باب سوم: مجوزہ کتب کا تقابلی مطالعہ

الف۔ کتب اور سوانح نگاروں کا تعارف 45
۱۔ پرورشِ لوح و قلم: فیض حیات اور تخلیقات 45
(الف)۔ لڈمیلا وسیلیئوا، تعارف 45
(ب)۔ پرورشِ لوح و قلم: فیض حیات اور تخلیقات، تعارف و تجزیہ 46
۲۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی 58
(الف)۔ ڈاکٹر ایوب مرزا، تعارف 58
(ب)۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی، تعارف و تجزیہ 59
۳۔ ذکرِ فیض 69
(الف)۔ سید مظہر جمیل، تعارف 69
(ب)۔ ذکرِ فیض، تعارف و تجزیہ 70
ب۔ اشتراکات 87
ج۔ افتراقات 89

د۔ تعینِ قدر 91

حوالہ جات 94

باب چہارم: مجموعی جائزہ

الف۔ مجموعی جائزہ 97

ب۔ تحقیقی نتائج 102

ج۔ سفارشات 103

کتابیات 104

ABSTRACT

Faiz Ahmed Faiz is one of the most celebrated Urdu poets of 20th century, all around the world, so there has always been a lot to write and speak about such a prominent figure but all it was in fragments; focusing mainly on Faiz's work till a few biographical books got compiled in some purposeful way. This research compares three of the biographies of Faiz Ahmed Faiz: "Ham K Thehry Ajnabi" by Ayub Mirza; "Parvarish-e-Lauh-O-Qalam" by Dr. Ludmila Vasilieva and "Zikr-e-Faiz" by Syed Mazhar Jamil. Dr Ludmila Vasilieva compiled the said biography in Russian and then co-translated it in Urdu. Dr. Ayub Mirza published his book during the life of Faiz Ahmed Faiz and it was discussed with Faiz himself. Syed Mazhar Jamil considered the need of a comprehensive biography of Faiz and he compiled a voluminous book on the life of Faiz Ahmed Faiz.

Writing of a biography demands authentication, truthfulness, unbiasedness as well as the style of presentation of the biographical content matters. Keeping in view the said standards of writing a biography; these three biographies are evaluated with the aim of comparing the content and its presentation to find the differences and similarities among these biographical books.

اظہارِ تشکّر

خدا تعالیٰ کا شکر ہے اور اسی ذات کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ رسولِ کریم ﷺ کا شکر گزار ہوں جو تمام علوم کا منبع ہیں۔

نگرانِ مقالہ پروفیسر روبینہ شہناز کا بے حد شکریہ جن کی شفقت اور رہنمائی سے میں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔ صدرِ شعبہ اردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم، کوآرڈینیٹر ڈاکٹر صائمہ نذیر، اساتذہ کرام، گھر والوں، عارفہ طاہر اور محمد علی خالد کا شکر گزار ہوں۔

سید تصدق حسین

سکالر ایم فل اُردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

(الف)۔ تمہید :

I۔ موضوع کا تعارف

اس مقالے کا موضوع فیض احمد فیض کی منتخب سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ فیض احمد فیض، قیامِ پاکستان کے بعد اردو کے سب سے زیادہ شہرت پانے والے شاعر ہیں۔ انہوں نے ادب پر اپنی شخصیت کے گہرے اثرات چھوڑے۔ ان کے فن پر متعدد جہات سے تنقید و تحقیق ہوتی رہی ہے۔ فن سے ہٹ کر فیض کے سوانحی حالات کے ساتھ ان کی شخصیت کو بطور خاص پیش کرنے والی کتب کی تعداد زیادہ نہیں۔ اس مقالے میں دستیاب کتب میں سے منتخب سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

منتخب کردہ سوانح عمریوں میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کی روسی زبان میں تحریر کردہ سوانح کا اردو ترجمہ "پرورشِ لوح و قلم فیض حیات اور تخلیقات"، ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریر کردہ سوانح "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"، سید مظہر جمیل کی کتاب "ذکرِ فیض" شامل ہیں۔

ii۔ بیان مسئلہ

فیض احمد فیض کی اردو ادب میں اہمیت کے تناظر میں ان کے سوانحی حالات پر مبنی مواد مختلف مضامین، انٹرویو، مقالہ جات اور کتب میں موجود ہے جس میں ان کی شخصیت اور فن کو مختلف جہات سے پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں باقاعدہ سوانح کی صورت میں دستیاب کتب میں سے منتخب سوانح عمریوں میں پیش کردہ معلومات کے تقابل کے ذریعے ان کے اشتراکات و افتراقات سامنے لاتے ہوئے ان کی قدر کا تعین کیا گیا ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

الف۔ فیض احمد فیض کی منتخب سوانح عمریوں کے اشتراکات تلاش کرنا

ب۔ مجوزہ سوانح عمریوں کے افتراکات سامنے لانا

ج۔ مجوزہ سوانح عمریوں کی قدر کا تعین کرنا

iv۔ تحقیقی سوالات

مجوزہ مقالے کے لیے مندرجہ ذیل سوالات مد نظر رکھے گئے ہیں:

ا۔ مجوزہ سوانحی کتب میں سوانح نگاری کے اصولوں کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے؟

۲۔ مجوزہ سوانح عمریوں میں موجود اشتراکات وافتراکات کیا کیا ہیں؟

۳۔ ان سوانح عمریوں کی انفرادیت یا ادبی حیثیت کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار

اردو ادب میں تقابل کی روایت موجود ہے۔اس کی ابتدا میتھیو آرنلڈ نے کی بعد ازاں فرانسیسی، جرمن اور امریکن اسکول سامنے آئے۔بنیادی طور پر ادب میں تقابل ادب پاروں کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کے حوالے سے ہوتا ہے۔رفیع الدین ہاشمی کے مطابق "سوانح عمری وہ صنفِ ادب ہے جس میں کسی فرد کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام واقعات اس کی ذہنی و عقلی نشوونما کے مختلف مراحل اور اس کی شخصی کارناموں کو بہ تفصیل بیان کیا جائے"۔ الطاف حسین حالی نے "حیاتِ جاوید" کے دیباچے میں سوانح نگاری کے اصول بیان کیے ہیں جس کے مطابق بنیادی اصول غیر جانبداری اور سچائی ہے۔

اس کے علاوہ شخصیت کی خوبیوں خامیوں کے بیان میں توازن، واقعات میں ترتیب اور اندازِ بیان میں ادبی رنگ کی موجودگی سوانح کے معیاری ہونے کی شرائط میں شامل ہیں۔سوانح نگاری کا فن استناد، غیر

جانبداری اور حقیقت نگاری کا متقاضی ہے۔ سوانح نگاری چونکہ کسی شخصیت کے متعلق معلومات کی فراہمی میں بنیادی طور پر مستند ذرائع اور حقائق کی درست تصویر کشی کی مرہون ہے لہٰذا اولین ترجیح میں ان منتخب کتب میں موجود معلومات کے ذرائع اور پیشکش میں موازنہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں پیشکش کے طریقہ کار کا جائزہ لیتے ہوئے منتخب کتب میں پیش کردہ معلومات کو سوانح نگاری کے اصولوں کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

اس مقالہ میں تجزیاتی اور تقابلی طریقہ کار کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لیے مجوزہ کتب کا مطالعہ، تجزیہ اور ان کے متعلق حسب ضرورت تبصرہ جات تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔ سوانح نگاری کے فن کے اصولوں روشنی میں مجوزہ سوانحی کتب کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے اشتراکات وافتراقات سامنے لائے گئے ہیں اور ان کی قدر کا تعین کیا گیا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

فیض کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت کام ہو چکا ہے۔ مضامین اور مونوگراف کے علاوہ کتابی صورت میں فیض کی شخصیت اور فن پر اردو کتب اور تحقیقی مقالہ جات موجود ہیں۔ تاہم فیض احمد فیض کی مجوزہ سوانح عمریوں کے تقابل کے حوالے سے کوئی کام تاحال سامنے نہیں آیا۔

Viii۔ تحدید

تحقیق کا موضوع مجوزہ کتب کا تقابلی مطالعہ ہے۔ سوانح نگاری کے اصولوں کے تحت ان کتب کا تقابل اور قدر کا تعین کیا گیا ہے۔ منتخب کتب کے علاوہ فنِ ترجمہ کاری، سوانحی کتب یا فیض احمد فیض کے فن سے متعلق تنقید اس مقالے میں شامل نہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

سوانح نگاری کے فن سے متعلق کتب مثلاً الطاف فاطمہ کی تحقیق "اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء" مولانا الطاف حسین حالی کی "حیاتِ جاوید"، اور فیض احمد فیض کے حوالے سے پروفیسر سحر انصاری کی

کتاب "فیض کے آس پاس"، اشفاق حسین کی کتاب "حبیبِ عنبر دست" اور تحقیقی مقالہ "فیض احمد فیض: شخصیت اور فن" ڈاکٹر ایوب مرزا کی "فیض نامہ" اور مرزا ظفر الحسن کی مرتب کردہ "خونِ دل کی کشید" اس ذیل میں شامل ہیں۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

فیض احمد فیض کے مقام کو سمجھنے میں ان کی شخصیت، سوانحی حالات اور دیگر محرکات کو واضح کرنے میں مجوزہ تقابلی مطالعہ فیض شناسی کی روایت میں ایک اہم اضافے کا باعث ہو گا ۔

ب۔ تقابل کیا ہے؟

تقابل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی موازنہ، آمنے سامنے یا مقابلے کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے comparison کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تقابل کسی ایک شے کا دوسری شے سے موازنہ کر کے ان میں اشتراکات و افتراقات کی تلاش کا نام ہے۔ تقابل بین اللسانی، بین الثقافتی، بین المذاہب، بین الاقوامی، بین الزمانی اور بین العلومی ہوتا ہے۔ تقابل مختلف زبانوں اور علاقوں کے ادب کے درمیان میں بھی ہو سکتا ہے اور ایک ہی زبان میں موجود مختلف فن پاروں کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی موضوع یا ایک ہی صنف پر مختلف زبانوں یا علاقوں یا زمانے کے لوگوں کی تحریروں کے درمیان تقابل کیا جاتا ہے۔

قدیم یونانی ناموں میں ارسطو، لونجائنس اور دیمتریس کے ہاں ڈراموں کے حوالے سے قدماء کی تخلیقات پر تقابلی جائزہ ملتا ہے۔ ہوریس نے لاطینی اور یونانی زبانوں میں تقابل پر کام کیا۔ دانتے نے اطالوی ادب میں اور پھر جان ڈرائیڈن نے انگریزی، بوبلووسینت بیو نے فرانسیسی، گوئٹے نے جرمن زبان میں تقابلی ادب کو متعارف کرایا۔

آغاز میں ایک ہی زبان میں موجود دو تحریروں کے تقابل کو قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایچ ایم پیچنٹ نے ۱۸۸۶ء میں ایک کتاب comparative literature کے نام سے تحریر کی۔ جس کے بعد اس کو ایک مستقل شعبے کی حیثیت ملنے لگی اور مغرب میں اس کو مستقل مضمون کے طور پر پڑھایا جانے لگا۔ ۱۹۱۰ء میں

سنسناٹی یونیورسٹی امریکہ میں تقابلی ادب کا شعبہ قائم ہوا۔اس زمانے میں ایف ڈبلیو چنڈلر،ریوینڈر آرتھر،ریونیڈ ایلن اور سی ایس مل فورڈ جیسے نام عالمی شہرت یافتہ ماہر تقابل کی حیثیت سے سامنے آئے۔۱۹۳۶ میں کلکتہ یونیورسٹی میں سر وپلی رادھا کرشنن نے مذاہب کے تقابل پر لیکچر دیا۔جو ۱۹۳۹ میں شائع بھی ہوا۔۱۹۳۸ میں ایک انگریز پروفیسر ڈبلیو ایس آرک ہارٹ نے بھی مذہب کے تقابل پر کتاب لکھی اور یہی روایت ادب کے تقابل کی پیش رو ثابت ہوئی۔

یورپ میں بھی سترہویں اور اٹھارویں صدی میں تقابلی ادب کی روایت مضبوط ہونے لگی تھی۔جے ای سینر گان اوررینے ویلک کی کتاب "modern english critical essays of seventeenth century criticism" میں تقابلی ادب کے متعلق نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔رابرٹ لوتھ کے لیکچروں میں تقابلی ادب کی تاریخ اور لاطینی اور طبرانی ادب کا تقابل پیش کیا گیا۔انیسیویں صدی میں تقابلی ادب کی شناخت الگ طور پر قائم ہوئی۔وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت بھی آتی گئی اور پھر ایک ہی زبان میں موجود مختلف تحریروں کا تقابل بھی کیا جانے لگا۔

میتھو آرنلڈ کے بقول:

> "Everywhere there is connection, everywhere there is illustration. No single event, no single literature is adequately comprehended except in relation to other events, to other literatures"

> ترجمہ:"ہر طرف رشتے بکھرے ہیں جن کے مظاہر ہمیں چاروں طرف نظر آتے ہیں کسی ادب پارے کی مکمل تفہیم اس کے دوسرے ادب پاروں اور واقعات کے ساتھ اس کے رشتے کی پہچان سے ہی ہو سکتی ہے۔"(۱)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تقابلی ادب اور تقابلی مطالعہ دو الگ چیزیں ہیں۔تقابلی ادب کے اصول الگ ہیں جن میں کلچر یا زبان کا بعد خصوصی طور پر مد نظر رکھا جاتا ہے۔یعنی مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے

لوگوں نے کسی ایک صنف کو کیسے برتا یا کسی ایک خیال کو کس طرح پیش کیا۔ لیکن تقابلی مطالعہ ادب یا موازنہ کسی بھی صنف کی دو یا دو سے زیادہ تخلیقات کے اشتراکات و افتراقات کے تجزیے اور ان کی قدر کے تعین کا نام ہے۔ یعنی تقابلی مطالعہ جن دو یا دو سے زیادہ ادب پاروں کا کیا جا سکتا ہے وہ ایک زبان اور ایک علاقے یا ایک کلچر کی پیداوار ہو سکتی ہیں۔

ا۔ تقابل کا طریقہ کار:

تقابل دو یا دو سے زیادہ اشیا کو ایک دوسرے کے مد مقابل رکھ کر ان کے مابین اشتراکات اور افتراقات کو متعین کرنے کے بعد ان سے نتائج اخذ کرنے کا عمل ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ مد مقابل میں مکمل جداگانہ انواع کو نہیں شامل کیا جا سکتا بلکہ ان کی بنیادی حیثیت یا نوع ایک جیسی ہونا لازم ہے:

> "موازنہ مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ چنانچہ باغ و بہار کا فسانہ عجائب سے موزنہ کیا جاتا ہے کہ دونوں داستانیں ہیں۔ غالب کی غزل کا مومن کی غزل سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر میں ان دو باکمال شعرا کا مرثیہ گو شاعروں کی حیثیت سے موازنہ کیا ہے۔" (۲)

تقابل کے لوازمات درج ذیل ہیں:

ا۔ تقابل ایک ہی صنفِ ادب اور جنس کے درمیان ہوتا ہے۔

۲۔ دو یا دو سے زیادہ ادب پاروں کے درمیان ہو سکتا ہے۔

۳۔ ان ادب پاروں میں کچھ اشتراکات ہونے چاہئیں۔

۴۔ ان ادب پاروں کے مابین کچھ افتراقات ہونے چاہئیں۔

۵۔ ان کی اقدار کا تعین کیا جاتا ہے۔

۶۔ان کی انفرادی خصوصیات کا تعین کیا جاتا ہے۔

تقابلی مطالعے کا مقصد کسی کی برتری ثابت کرنا نہیں ہوتا لیکن یہ بات بھی ممکن نہیں کہ دو یا دو سے زیادہ فن پارے ہر لحاظ سے ایک جیسے ہوں لہٰذا ان کے درمیان پائے جانے والے اشتراکات اور افتراکات کو سامنے لا کر کسی اصول کے تحت ہر ادبی تخلیق کی قدر کو متعین کیا جاتا ہے:

> "اصولاً موازنہ میں ترجیح کا سوال شامل نہیں لیکن بالعموم موازنہ کرنے
> والے نقاد ایک فنکار یا فن پارے کی دوسرے فنکار یا فن پارے پر ترجیح
> ثابت کرنے کی خواہش سے کلی اجتناب کرتے نہیں برت سکتے۔"(۳)

یعنی تقابلی مطالعے کے بعد لازمی طور پر کسی ایک ادب پارے میں خوبی یا کمی دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتی لہٰذا کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی بنا پر ایک تخلیق کو دوسرے سے بہتر یا کم تر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ برتری کسی وجہ سے یا کسی خاص پہلو کے حوالے سے ہوتی ہے۔ تخلیق بجائے خود کسی سے بہتر یا کم تر ہونے کی بجائے فنی طور پر کمزور یا بعض پہلوؤں پر جاندار سمجھی جا سکتی ہے۔اس طرح فن کی روایت بھی مضبوط ہوتی ہے اور آئندہ کے لیے تخلیق کاروں کو اپنی تخلیقات کو بہتر بنانے میں آسانی بھی رہتی ہے۔

۲۔اقسام اور روایت:

موازنہ اور تقابلی مطالعہ کرنے کے لیے طریقہ کار کی دو اقسام متعین ہیں۔

ا۔بیانیہ تقابل(Descriptive comparison):

اس طریقہ کار میں فن پارے کے اسلوب اس کے اندازِ بیان اور اظہارِ فن کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے کہ کس صنف میں لکھا گیا فن پارہ اس کی ہیئت، روایت اور فنی تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔ اس میں ان فن پاروں کی اثر پذیری کو زیرِ بحث نہیں لایا جاتا۔یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک خیال کس سانچے میں کس طرح پیش کیا گیا۔ مثلاً اگر غزل کا بیانیہ تقابل کیا جائے گا تو اس کے فنی لوازمات اور ہیئت کے ظاہری پن کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔یعنی اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ کون سی بحر استعمال کی گئی ہے۔ اوزان کی پابندی کس حد

تک ہے، ردیف قافیہ اور مطلع مقطع کی پابندی کس حد کی برتی گئی ہے۔ یہ طریقہ کار معروضی ہوتا ہے اور اس میں قطعیت پائی جاتی ہے۔

ب۔ تعینِ اقدار کا تقابل (Normative comparison):

فن پاروں کی قدر کا تعین کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ نارمل سے یعنی جو رائج اقدار ہیں ان سے کتنا میل کھاتے ہیں اور ان کی معنوی حیثیت، ابلاغ اور اثر پذیری کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ یہ ظاہری ہیئت کی بجائے باطنی اور معنوی اقدار اور اس تخلیق کے دائرہ اثر کو موضوع بنا کر موازنہ کرنے کا نام ہے۔

یعنی بیانیہ میں "کیسا ہے" اور تعین قدر میں "کیسا ہونا چاہیے" کو پرکھا جاتا ہے۔ تاہم یہ بات مدِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ ادب کی تمام تعریفیں حتمی نہیں ہوتیں بلکہ وقت کے ساتھ تبدیلی ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا وقت کی تبدیلی کے ساتھ معیار کی تبدیلی بھی عمل میں آتی رہتی ہے۔ ادب پاروں کے تقابل میں ان کی افادیت اور تسکین آوری کے علاوہ روحانی، نفسیاتی، جمالیاتی اور نظریاتی پہلو بھی مدِ نظر رکھے جاتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو پرکھتے ہوئے خارجی اور داخلی محرکات کو بھی سامنے رکھا جائے گا۔ ابتدا سے مختلف مکاتب فکر نے تقابلی مطالعے کے اپنے اپنے طور پر کچھ اصول وضوابط متعین کیے جن کے مختصر تعارف ذیل میں درج ہے:

فرانسیسی مکتبہ فکر

۱۹۰۵ میں اس مکتبہ فکر کا آغاز ہوا جس میں کسی بھی فن پارے کے اصل مآخذ کا موازنہ کرنے پر توجہ دلائی گئی۔ اس دور میں فرانس صنعتی ترقی میں آگے تھا اور اسے اپنی برتری کا احساس تھا:

> "فرانسیسی تناظر میں ثقافتی تنقل کا مطالعہ اہم رہا ہے۔ جس میں فرانس ہمیشہ اثر لینے یا دینے والا ہوتا ہے۔ ایسے مطالعہ کا مقصد قومی اوصاف کی تعریف اور خاکہ کشی ہوتا ہے"(۴)

یعنی اس تحریر یا تخلیق کے پس پردہ سوچ اور فکر کہاں سے در آئی اور عوام میں کون سی تخلیق نے کس طرح پذیرائی حاصل کی یا ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک فن پارہ کس انداز میں کس طرح پہنچا۔ یہ سکول آف تھاٹ مغربی دانشوروں تک محدود رہا۔

جرمن مکتبہ فکر

اس کی ابتدا ۱۸۷۰ء کے قریب ہوئی تاہم باقاعدہ زور و شور سے ۱۹۰۵ء میں شہرت حاصل کی۔ جرمنی اس وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھا جو کسی سیاسی مرکزی وحدت کی تلاش میں تھیں۔ اس مکتبہ سے تعلق رکھنے والوں نے طویل گیتوں اور ڈراموں کے موازنے کا آغاز کیا جو کہ ساختیات کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ بعد ازاں اس نے اطلاقی تقابل کی شکل اختیار کی اور دریافت ہونے والے حقائق کو تحریروں میں برتا جانے لگا تاکہ فن پاروں کی افادیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاسکے۔ جرمن سکول آف تھاٹ قوم کی روح اور قوم پرستی پر دھیان دیتا تھا۔ اس سکول کے تحت موازنہ یا تقابل بھی مغربی ممالک تک محدود رہا۔ فرانس اور جرمنی میں تقابلی مطالعے کا الگ الگ پہلو زیادہ حاوی رہا:

> "مزید یہ کہ فرانس کے تقابلی سکالر انسانی ذہن کے پراڈکٹ پر زیادہ دھیان دیتے تھے جبکہ جرمن ماہرین تقابلیات قوم کی جڑوں یا روح کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ایسے اصطلاحی اور تاکیدی فرق کی وجہ انیسویں صدی کے فرانس اور جرمنی کی مختلف ثقافتی روایتیں اور سیاسی اور معاشی ترقی کے نقوس میں تفریق تھی"(۵)

ان دونوں مکاتبِ فکر نے تقابل کو محدود کر کے استعمال کیا جس کے ردِ عمل میں ایک نیا مکتبہ فکر سامنے آیا۔

امریکن مکتبۂ فکر

یہ مکتبہ فکر فرانسیسی سکول کے ردِ عمل میں سامنے آیا۔ اس مکتبہ سے تعلق رکھنے والوں نے اس بات پر زور دیا کہ فن پارے کے مآخذ سے زیادہ یہ بات اہم ہے کہ تمام انسانیت کے لیے فائدہ مند ادب کو تلاش کیا جاسکے۔ ان کے مطابق خالص ادبی تنقید اور تحقیق زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہنری ریمیک نے امریکی دبستان کی بنیاد رکھی۔ یہ فرانسیسی ماڈل سے بالکل جداگانہ تھا اور اس نے فرانس کا اثر تقابلی مطالعہ ادب سے کم کر دیا اور اس کے ساتھ سیاست کے اثر سے بھی ادب کو باہر نکالنے کی بھرپور کوشش کی۔

"تقابلی ادب کے میدان سے سیاست کو خارج کرنا امریکی دبستان کا طرۂ
امتیاز ہے جو یورپ میں تقابلی ادب کی نمو سے حد درجہ مختلف ہے"(۶)

یہ مکتبہ مغربی ممالک کی حدود سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گیا اور اس کے تحت تقابلی مطالعوں کی روایت میں وسعت آئی۔ تقابلی ادب میں مختلف زبانوں یا کم از کم مختلف اقوام یا علاقوں میں تخلیق کیا جانے والا ادب مروجہ اصولوں پر پرکھا جاتا ہے اور ایک ہی علاقے میں لکھی جانے والی یا ایک ہی زبان کے قلم کاروں کی تخلیقات میں موازنے کو تقابلی مطالعے کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو میں تقابلی مطالعے کے ابتدائی دنوں میں انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، انجمن کی ابتدا کے موقع پر آزاد کے خطبے میں اردو شاعری اور مغربی شاعری کا موازنہ پیش کیا گیا تھا۔

حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں تنقید اور تقابل کے اصول وضع کیے۔ میر و غالب کی غزل، خسرو اور درد کے ہاں تصوف کا مضمون، انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری کا تقابل یا شبلی اور حالی کی سوانح نگاری کا موازنہ اور پھر ایک صنف میں مقامی زبانوں میں موجود ادب کا اردو سے تقابل مثلاً پنجابی مثنوی ہیر وارث شاہ کا اردو مثنوی سحر البیان سے تقابل یا ایک شاعر کی دو زبانوں میں شاعری مثلاً میر کی اردو اور فارسی شاعری یا غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا تقابل اور اسی طرح متعدد حوالوں سے ادب میں تقابلی مطالعے کی روایت سامنے آئی۔

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تقابلی ادب اور ادب کا تقابلی مطالعہ دو الگ چیزیں ہیں۔ تقابلی مطالعہ ایک ہی زبان کے دو مختلف اوقات میں لکھے گئے یا دو یا دو سے زائد زبانوں کے ادب، تہذیب و ثقافت،

سماج و سیاست، معیشت، مذہب وغیرہ کے ساتھ ساتھ ظاہری اور باطنی سطح پر ادبیات کی جمالیات اور خصوصیات کا مطالعہ ہے، تقابلی مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں فن پاروں میں کوئی ایک یا ایک سے زیادہ قدریں مشترک ہوں، یعنی زبان، صنف، موضوع، تکنیک میں مماثلت ہو، یا زیر مطالعہ ادب پاروں کا ماخذ ایک ہو یا وہ کسی ایک جیسے رجحان یا نظریے یا تحریک کے اثر کے تحت تخلیق ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں ان کا مطالعہ کر کے ان کے اشتراکات اور افتراقات کو سامنے لانے کا نام تقابلی مطالعہ ہو گا۔ یعنی تقابلی مطالعے کے لیے بیانیے کا اور قدر کا موازنہ کر کے اشتراکات اور افتراقات واضح کیے جاتے ہیں۔

ج۔ فیض احمد فیض: تعارف

فیض احمد فیض کا نام اردو ادب کے اہم ترین اور چوٹی کے شعراء کی فہرست میں آتا ہے۔ اردو ادب میں علامہ اقبال کے بعد فیض احمد فیض سب سے عظیم شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ آپ بیک وقت شاعر، مترجم، مصنف اور صحافی تھے۔ فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔[۷] آپ کے والد کا نام سلطان محمد خان تھا جو بیرسٹر تھے اور افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن خان کے ہاں چیف سیکرٹری بھی رہے۔ انھوں نے افغان امیر کی سوانح حیات شائع کی۔ سلطان محمد خان کی شخصیت ایسی تھی اور ان کی کہانی بھی اتنی دلچسپ تھی جسے ان کی قریبی دوست انگریز خاتون، افغان فرمانروا امیر عبدالرحمٰن کی شاہی طبیبہ لِلیئس ہیملٹن نے ایک ناول "A Vazir's Daughter-A Tale of the Hazara War" میں امر کر دیا۔

فیض کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ تھا۔ یہ سلطان محمد کی سب سے چھوٹی بیگم تھیں ان سے ۱۹۰۸ میں ان کا پہلا بیٹا، طفیل احمد پیدا ہوا، جس کے تین سال بعد فیض احمد فیض اور پھر مزید دو بیٹے عنایت اور بشیر پیدا ہوئے۔۔ طفیل احمد جج بنے، فیض ایک استاد، صحافی اور مشہورِ زمانہ شاعر، عنایت فوج میں میجر بنے؛ سب سے چھوٹے بیٹے بشیر معذوری کا شکار تھے۔

گھر میں دینی ماحول تھا۔ افراد خانہ صوم و صلوۃ کے پابند تھے اور قرآن حکیم کی تلاوت کی جاتی تھی۔ فیض احمد فیض کی پرورش میں ان کی والدہ اور ان کے والد کی دیگر بیگمات کا بہت اثر تھا۔ فیض کے والد کی پہلے بیوی افغان امیر کی بھتیجی تھیں اور فیض کی والدہ سلطان فاطمہ سب سے چھوٹی اور آخری تھیں جن سے انھوں

نے سیالکوٹ واپسی پر شادی کی تھی، اس وجہ سے تین زبانیں- اردو، فارسی، پنجابی- سلطان محمد کے گھر میں بولی جاتی تھیں۔ اس کا بعد میں فیض کو بہت فائدہ ہوا کہ کہیں رسماً سیکھے بغیر ہی ان کو بچپن سے فارسی اور اردو پر عبور حاصل تھا۔

بچپن میں فیض احمد فیض اپنے والد سلطان محمد کے ساتھ محلے کی مسجد میں فجر کی نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد مسجد کے امام مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی کے درسِ قرآن میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ شرکت کرتے تھے۔ فیض نے مولوی صاحب سے قرآن حکیم کے تین پارے حفظ کیے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ انٹرویو کہا کہ انھیں اس کا قلق ہے کہ انہوں نے پورا قرآن حفظ نہیں کیا۔ فیض نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، اس نے انھیں اپنی جڑوں سے کٹنے نہیں دیا۔ اسی ماحول کا اثر تھا کہ وہ آخری دم تک اپنی روایات سے دور نہیں ہوئے۔ فیض کا بچپن گھر کی خوشحالی اور سکون میں بے فکر اور خوشگوار دور تھا۔ اس وجہ سے ان کے والد کی اچانک اور غیر متوقع موت کے بعد میں ان پر آنے والی مشکلات اور زیادہ اندوہ ناک ثابت ہو رہی تھیں۔ تاہم ان کو پرورش کے ابتدائی عرصے میں ملنے والی محبت نے ان کی شخصیت اور شاعری پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

آپ کے اساتذہ میں میر مولوی شمس الحق، جو علامہ اقبال کے بھی استاد تھے، بھی شامل تھے۔ آپ نے سکول کے اور گھر کے ماحول میں فارسی اور عربی زبان سیکھی۔ ۱۹۲۱ء میں فیض نے سکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا اور یہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد آپ نے ایف اے کا امتحان مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کیا۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور پھر وہیں سے ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں ایم اے کیا۔ بعد میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں بھی ایم اے کیا۔

فیض کے گھر سے کچھ دوری پر ایک حویلی تھی جہاں پنڈت راج نارائن ارمان مشاعروں کا انعقاد کیا کرتے تھے، جن کی صدارت منشی سراج الدین کیا کرتے تھے۔ انہی محفلوں سے فیض شاعری کی طرف مرغوب ہوئے اور اپنی پہلی شاعری دسویں جماعت میں قلمبند کی۔ ایم۔ اے کے بعد آپ نے ادبِ لطیف کی ادارت سنبھالی، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج امرتسر اور بعد ازاں ہیلے کالج لاہور میں انگریزی اور برطانوی ادب

کے استاد رہے۔ سجاد ظہیر، صاحبزادہ محمود الظفر اور فیض احمد فیض نے انجمنِ ترقی پسند مصنفین تحریک کا آغاز کیا۔

۱۹۴۱ء میں فیض احمد فیض کی شادی ایلس جارج سے ہوئی جن کا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا تھا۔ یہ تاثیر کی اہلیہ کی چھوٹی بہن تھیں جو ۱۶ سال کی عمر سے برطانوی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھیں۔ شادی کی تقریب سرینگر میں ایم ڈی تاثیر کے مکان پر منعقد ہوئی۔ نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا۔ مجاز اور جوش ملیح آبادی نے تقریب میں شرکت کی۔ ایلس انھوں نے فیض کے ساتھ زندگی کے سارے موسموں کے بھرپور رنگ دیکھے۔ فیض اور ایلس فیض کی دو بیٹیاں منیزہ اور سلیمہ پیدا ہوئیں۔ ۱۹۴۷ میں فیض نے میاں افتخار الدین کے اصرار پر پاکستان ٹائمز کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اسی دور میں فیض نے فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر رہتے ہوئے بھی کام کیا اور دوسری جنگ عظیم میں عملی طور پر شریک بھی رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی کشمیر جنگ کے بعد آپ فوج سے مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔

آپ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی بانیوں میں سے ایک تھے۔ مختلف ادوار میں مختصر اور راولپنڈی سازش کیس میں نامزد ہو کر مارچ ۱۹۵۱ء سے اپریل ۱۹۵۵ء تک قید بھی کاٹی۔ آپ کی کتاب زنداں نامہ کی بیشتر شاعری اسی دور کی یادگار ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی سزا معاف ہوئی اور رہائی کے بعد وہ لندن چلے گئے لیکن ۱۹۵۸ء میں وطن واپسی کے بعد انھیں دوبار گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی کوششوں سے ان کو رہائی ملی اور وہ رہا ہونے کے بعد ماسکو اور اس کے بعد لندن روانہ ہو گئے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں ایشیا، افریقہ، امریکہ اور یورپ کے مختلف ممالک مثلاً بھارت، چین، امریکہ، کیوبا، لندن، ہنگری، الجیریا، مصر، انگلینڈ، سوویت یونین کا بارہا دورہ کیا۔ ۱۹۶۴ء میں وطن واپسی کے بعد انھوں نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور پھر آپ آرٹس کونسل کے ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر بھی رہے۔ آرٹس کونسل سے مستعفی ہونے کے بعد فیض، عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل کے طور بھی فرائض انجام دیتے رہے، ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کا تختہ الٹا تو فیض کے لئے پاکستان میں رہنا مشکل ہو گیا۔ اگرچہ فیض کی وطن واپسی کے لیے جنرل ضیاء نے ذاتی طور پر اصرار کر کے بلایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ ان کو ہراساں نہیں کیا جائے گا لیکن فیض قوم کی تیرہ وقتی اور عوام کی حالتِ زار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ اس لیے

بھی تھا کیونکہ فیض ایک مدت سے ان کی حقوق کے لیے اٹھنے والی ایسی مؤثر ترین آواز کا کام کر رہے تھے جو دنیا کے کونے کونے میں پہنچ سکتی تھی۔ جنرل ضیاء کی یقین دہانی کے باوجود پولیس اور خفیہ ایجنسیاں فیض کا ہر جگہ پیچھا کر رہی تھیں۔ ان کی سخت نگرانی کی جارہی تھی۔ ایک دن وہ گھر سے یوں نکلے جیسے چہل قدمی کے لئے جا رہے ہوں اور سیدھے بیروت پہنچ گئے۔ اس وقت فلسطینی تنظیم آزادی کا مرکز بیروت میں تھا اور یاسر عرفات سے ان کا یارانہ تھا۔ بیروت میں وہ سوویت امداد یافتہ رسالہ لوٹس کے مدیر بنا دئے گئے۔ ۱۹۸۲ میں، خرابیٔ صحت اور لبنان جنگ کی وجہ سے فیض پاکستان واپس آ گئے۔ وہ دمہ اور لو بلڈ پریشر کے مریض تھے۔

ان کی زندگی میں ہی ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت کو پر لگ چکے تھے اور ان کی آواز سرحدوں اور زبانوں کی قید توڑ کر ساری دنیا تک پھیل چکی تھی اور اپنا اثر دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچا رہی تھی۔ ان کی شاعری کہیں انقلاب کی جوشیلی آواز بن رہی تھی کہیں عشق کی کسک کے مدھر نغموں کا سوز بکھیر رہی تھی۔ فیض نے اپنے کلام میں جو استعارے برتے ہیں اور جن تلمیحات کا استعمال کیا ہے وہ ہماری تہذیب کا سرمایہ ہیں۔

انہوں نے منصور کے انا الحق کو انقلابی نعرے کی حیثیت دی۔ حضرت حسینؑ کا مرثیہ لکھا۔ انھوں نے فارسی میں ایک خوبصورت نعت بھی تحریر کی جو کہ "نسخہ ہائے وفا" کا اختتامیہ ہے۔ ان کے الفاظ نے انسان دوستی اور جبر و استحصال کے خلاف ڈٹ جانے کو اپنا مطمع نظر بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف ملکِ پاکستان بلکہ پوری دنیا کی انسانیت کے لیے آواز بلند کی اور ان کی شاعری نے دنیا بھر میں اپنا تاثر چھوڑا۔ انھوں نے مزدوروں کے حقوق کے لیے جہاں عملی طور پر حصہ لیا وہاں اپنے قلم کے ذریعے بھی مزدوروں اور اسی طرح معاشرے کے دیگر مظلوم طبقات کے لیے بھی جدوجہد کی۔

انھوں نے جدید دور کے تقاضوں سے اپنی شاعری کو ہم آہنگ کیا۔ ان کی شاعری میں کئی اردو، انگریزی شعرا کا اثر محسوس ہوتا ہے لیکن آواز ان کی اپنی ہے۔ اس میں اک نئی کیفیت کے ساتھ ساتھ تازہ احساس اور اک خاص ولولہ ملتا ہے جس میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ فیض کی شاعری کا دھیما پن اور غنا لوگوں کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیتا تھا۔ ان کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی طرح بہت وسیع النظر تھی۔ آپ کی تخلیقات کی فہرست درج ذیل ہے:

نقش فریادی، ۱۹۴۱ء

دست صبا، ۱۹۵۲ء

زنداں نامہ، ۱۹۵۶ء

دست تہ سنگ، ۱۹۶۳ء

سر وادی سینا، ۱۹۷۱ء

شام شہر یاراں، ۱۹۷۸ء

مرے دل مرے مسافر، ۱۹۸۰ء

غبارِ ایام، ۱۹۸۲ء

سارے سخن ہمارے (کلیات عالمی ایڈیشن)، ۱۹۸۴ء

نسخہ ہائے وفا (کلیات پاکستانی ایڈیشن)، ۱۹۸۴ء

میزان (تنقیدی مضامین)، ۱۹۶۰ء

صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط)، ۱۹۷۱ء

متاعِ لوح و قلم (مرتبہ مرزا ظفر الحسن)، ۱۹۸۳ء

مہ و سالِ آشنائی (یادیں اور تاثرات)، ۱۹۷۹ء

فیض احمد فیض نے دو فلموں "جاگو ہوا سویرا" اور "دور ہے سکھ کا گاؤں" کے لئے گیت بھی لکھے۔ مذکورہ فلم "جاگو ہوا سویرا" فیض احمد فیض کے لیے ایک پریشان کن تجربہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے مزید فلم کے لیے کام نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۶ء میں لوٹس انعام برائے ادب، لینن امن ایوارڈ، نگار ایوارڈ، ابنِ سینا ایوارڈ اور متعدد انعامات حاصل کیے۔ ۱۹۹۰ء میں ان کو پاکستانی حکومت کی طرف سے سب سے بڑے سویلین ایوارڈ نشانِ امتیاز سے نوازا گیا۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء کو نصف شب کارڈک استھیما کا غلبہ ہوا اور ہنگامی طور پر انھیں ہسپتال لے جایا گیا۔ فیض احمد فیض نے ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کی دوپہر میو ہسپتال لاہور میں انتقال کیا اور ۲۱ نومبر کی سہ پہر انھیں ماڈل ٹاؤن، لاہور کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا جس شہر میں انھوں نے زندگی کے آخری برس گزارے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک جائزہ، مترجم توحید احمد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۸

۲۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۵۵

۳۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۴۔ سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک جائزہ، مترجم توحید احمد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۷

۵۔ ایضاً، ص ۳۷

۶۔ ایضاً، ص ۴۸

۷۔ صہبا لکھنوی، فیض نمبر: ماہنامہ افکار، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۵

باب دوم

سوانح نگاری کا فن، اصول اور روایت

ا۔ سوانح نگاری کیا ہے؟

سوانح نگاری ایسی صنف ہے جس میں کسی شخصیت کے پیدائش سے وفات تک حالاتِ زندگی کو مناسب انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ سوانح کسی بھی شخصیت کی زندگی کے خارجی اور داخلی حالات کو جذبات کو اس طرح بیان کرنے کا فن ہے جس سے اس شخصیت کی تصویر انسان نے قدیم زمانے سے اپنے پسندیدہ لوگوں کے حالاتِ زندگی کو بیان کرنا شروع کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور ان کے حالاتِ زندگی قابلِ بیان تھے۔ اس کے بعد مختلف لوگوں نے سینہ بہ سینہ اس روایت کا انتقال جاری رکھا۔

قدیم زبانوں میں دریافت شدہ تحریروں کے متعلق بھی قیاس غالب یہی ہے کہ یہ گزشتہ افراد کے متعلق یا ان کے کارناموں کی تفاصیل ہیں۔ اہرامِ مصر میں فراعنہ اور حنوط شدہ مردوں کے ساتھ، مقبروں سے ملنے والے بھوج پتر قدیم ترین تحریروں میں شامل ہیں جن میں مدفون کے متعلق سوانحی حالات تحریر ہوتے تھے۔ اس طرح اہرامِ مصر کی دیواروں پر منقش تحریروں کو سوانح نگاری کے اولین نمونے کہا جا سکتا ہے۔

سوانح نگاری کا فن سب سے پہلے یہودیوں کے ہاں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے متقدمین کے حالات کو یکجا کر کے رکھا اور پیش کیا۔ بادشاہوں کی سوانح اور مذہبی شخصیات کی سوانح لکھی جاتی تھیں۔ سوانح نگاری میں اسلام کی آمد سے مستند معلومات کا رجحان سامنے آیا۔ قرآن میں کئی پیغمبروں اور گزشتہ امتوں کے احوال ہیں، احوال نگاری کی خوبصورت مثال سورۃ یوسف ہے جس کی تیسری آیت میں خدائے واحد نے فرمایا:

"نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ"۔

یعنی ہم نے تم پر یہ قرآن جو وحی کے ذریعے بھیجا ہے، اُس کے ذریعے ہم تمہیں ایک بہترین واقعہ سناتے ہیں۔ انسان کی فطرت میں یہ لگاؤ موجود ہوتا ہے وہ اپنے سے پہلے لوگوں کی زندگی کے حالات وواقعات کو جاننا چاہتا ہے، ان کی زندگی سے موازنہ کرنا چاہتا ہے۔ بقول احمد فرازؔ

؎ اب اگلے زمانوں کے ملیں لوگ تو پوچھیں

جو حال ہمارا ہے، تمھارا بھی کبھی تھا؟

"سوانح کے لغوی معنی ماجرے ،احوالات ،واقعات ،حاداثات ،حوادث اور سانحہ کے ہیں۔ سوانح عمری کے لغوی معنی سرگزشت، کسی شخص کی زندگی کا حال، تذکرہ کسی عالم خواہ فاضال خواہ بڑے بڑے کام کرنے والے یا بہادر یا حاکم کے وہ واقعات جو اس کی عمر میں گزرے ہوں۔"(۱)

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے مطابق: ''مشہور آدمیوں کا حال لکھنا، جس کو یونانی میں بایوگرافی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں۔''(۲) رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''اصنافِ ادب' میں سوانح عمری کی تعریف یوں کی ہے:

''سوانح عمری وہ صنفِ ادب ہے جس میں کسی فرد کی پیدائش سے لے وفات تک کے تمام واقعات اس کی ذہنی و عقلی نشو و نما کے مختلف مراحل اور اس کی شخصی کارناموں وغیرہ کو بہ تفصیل بیان کیا جائے ضروری نہیں کہ یہ فرد کوئی پیغمبر، نامور مصلح، اولوالعزم جنگجو، باجبروت حکمران، معروف ادیب یا غیر معمولی شہرت کا مالک سیاست دان ہو۔ ایک غیر معروف، معمولی اور گم نام انسان بھی سوانح نگاری کا موضوع بن سکتا ہے۔''(۳)

سوانح عمری کسی فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک اس کے خارجی حالات اور داخلی کیفیات کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک اچھا سوانح نگار، صاحب سوانح کی شخصیت اور حالات کو پیش کرنے میں انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقیت ہے کہ بحیثیت انسان، سوانح نگار اپنے ذاتی خیالات و افکار سے سوانح کو مکمل نہیں بچا سکتا۔ لیکن وہ حتی المقدور غیر جانبدار رہ کر درست معلومات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

سوانح نگار کو صاحب سوانح کے ساتھ مخلص ہونا چاہیے۔ اور اس کا مقصد صاحب سوانح کی زندگی کے واقعات و حالات کو یکجا کر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔ تاہم بعض اوقات سوانح کسی خاص مقصد یا نظریے کے تحت لکھی جاتی ہے۔ بعض اوقات سوانح تجارتی مقاصد کے لیے بھی لکھی جاتی ہے۔ قدیم ادوار میں سوانح عمری اکثر بزرگان، اکابرین اور حکمرانوں کی زندگیوں تک محدود تھی۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کتب تحریر کی جانے لگیں جن میں ان کے حالاتِ زندگی مکمل استناد کا خیال رکھتے ہوئے تحریر ہوتے۔ سیرت نگار بہت زیادہ محتاط ہو کر سیرت کو قلمبند کرتے تھے۔ اس کے برعکس جو دیگر سربراہانِ ریاست یا شخصیات کی سوانح لکھی جاتی تھی تو اس کا مقصد یا تو مالی منفعت ہوتا تھا یا پھر اپنے کسی خیال یا مقصد کی ترویج کرنا، اس کے علاوہ بادشاہوں اور مذہبی شخصیات کی سوانح میں مبالغہ اکثر ہوتا تھا۔ یعنی بادشاہوں یا حکمرانوں کی سوانح عمریاں مدحیہ انداز میں لکھی جاتی تھیں اور کم و بیش ان کا مقصد منفعت حاصل کرنا ہوتا تھا۔

ایک تحقیق کے مطابق سب سے پہلے دوسری صدی عیسوی میں پلوٹارک نے سوانح لکھی۔ پلوٹارک یونان کا رہنے والا تھا اور اس کی پیدائش کیرونیا میں ہوئی تھی۔ اس نے جولیئس سیزار اور الیگزینڈر کے علاوہ کل چھیالیس امراء و اشرافیہ کا احوال قلمبند کیا تھا۔ مغرب میں یہ صنف بہت اچھے طریقے سے پھلی پھولی اور انگریزی میں سوانح نگاری کا رجحان پنپتا رہا۔ ہنری ہشتم کے دور سے انگریزی سوانح نگاری کا عناصر نے ابھرنا شروع کیا اور وقت کے ساتھ اس میں بہتری آتی گئی۔ جیمز بوسویل کی تحریر "دی لائف آف سیموئیل جانسن" کو انگریزی کی پہلی جدید سوانح مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگریزی میں سوانح نگاری کا رواج اس قدر ہوا کہ قراۃ العین حیدر ''کارِ جہاں دراز ہے'' کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

"مغرب میں کسی ادیب یا شاعر کا نام لیجیے۔ہر برٹ ریڈ،ورجینیا وولف،شان اوکیسی،ولیم یلومر،سر اوز برٹ سیٹول،ایلزبتھ بوون،اسینڈر،اسر ووڈ،سارتر،سیمون دی بووا،(جوزف ہون،سیکتھ بیرس،ہر برٹگور میں وغیرہ پروفیشنل سوانح نگاروں سے قطع نظر)اور ان کے لکھے ہوئے سوانحی ادب کا انبار آپ کو مل جائے گا۔" (۴)

تاہم صرف انگریزی یا اردو کی بات نہیں دنیا بھر کی زبانوں میں سوانح عمریاں ملتی ہیں۔ لیکن اردو زبان میں تحریر شدہ سوانح عمریوں نے عربی، فارسی اور انگریزی سے اثرات زیادہ قبول کیے ہیں۔

۲۔سوانح کی اقسام:

قدیم ادب سے درج ذیل صورتوں میں سوانح کی اقسام ملتی ہیں:

ا: سیرت: اسلامی ادب میں یہ صنف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے تذکرے کے لیے مخصوص ہے اور سیرت میں حیاتِ مبارکہ کے تمام واقعات، غزوات، اخلاق وعادات اور وحی کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام اور دیگر اکابرین کی سیرت پر کتب تحریر کی گئی ہیں۔

۲۔ مغازی: ایسی کتب جن میں غزوات یا جنگوں کا تذکرہ اور احوال درج ہوں اس طرح کی کتب کے ابتدائی نمونے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور سے عربی زبان میں ملتے ہیں۔ بادشاہوں کی زندگیوں پر لکھی کتب میں بھی ایسی کتابیں موجود ہیں۔

۳۔طبقات: طبقات، طبقہ کی جمع ہے اور اس سے مراد ایک درجہ علم یا کسی اور حیثیت میں شریک افراد ہوتے ہیں۔ اس میں تذکروں کو ان کے ادوار یا پھر علاقوں کی نسبت سے مدون کیا جاتا تھا۔ مثلاً طبقات ابن سعد، طبقات الشعراء، طبقات الاطباء وغیرہ، ان میں زیادہ تر ایک زمانے کے لوگوں کا تذکرہ شامل ہوتا تھا۔

۴۔ معجم: اس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے مختلف طبقات کے مختصر حالات لکھے جاتے تھے۔ یہ علمِ حدیث میں بھی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس علم کے اساتذہ کے احوال کو مختصراً شامل کیا جاتا تھا۔

۵۔ مناقب: اولیائے کرام یا بزرگانِ دین کے حالات زندگی جن میں ان کی شان کو بیان کیا جاتا تھا۔ ان کا بنیادی مقصد صحابہ، اہلِ بیت یا بزرگان کی مدح ہے۔ اس طرح ممدوح کے حالات زندگی اور عادات و خصائل کو مدحیہ انداز سے پیش کیا جاتا تھا۔

۶۔ ملفوظات: کسی بڑی شخصیت کے چند مخصوص پہلو کو پیش کرنے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اس میں کسی دانشور یا بزرگ کی سوانح اور ان کے پند و نصائح یکجا کر کے شامل کیے جاتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد اساتذہ و بزرگان کے مواعظ کو عوام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

۷۔ یادگار: یہ درحقیقت خراجِ تحسین کے انداز میں لکھی جاتی تھیں۔ اسی طرح گروہی طرز کی سوانح یا تذکرے جن میں خصوصاً شاعروں نے تذکرہ نگاری کو بہت فروغ دیا۔ تاہم ان میں زیادہ تر فن کو زیرِ بحث لا کر ان پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کے ساتھ کسی شخصیت کی سوانح کے لیے اہم معلومات کی رسانی بھی ہوتی تھی۔

۸: خودنوشت: کسی شخصیت کے اپنے قلم سے اپنے حالاتِ زندگی کا بیان خودنوشت سوانح عمری کہلاتا ہے۔ یہ سوانح نگاری کی ایک مشہور صنف ہے۔ بعض اوقات خطوط کو بھی خودنوشت کے قریب ترین قرار دیا جاتا ہے۔

۳۔ سوانح نگاری کے اصول اور لوازمات

سوانح نگاری میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جاتا ہے۔

الف۔ موضوع کا انتخاب

سب سے پہلی چیز جس کو مدِ نظر رکھا جائے وہ صاحبِ سوانح کا انتخاب ہے یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ جس شخصیت کی زندگی کو قلمبند کیا جارہا ہے وہ خود کتنی عظیم یا گراں قدر شخصیت ہے اس کے ساتھ اس کی زندگی میں جتنے زیادہ موڑ آئے ہوں گے اتنی ہی دلچسپ اور جامع سوانح تخلیق ہو گی:

> "موضوع کے انتخاب کے وقت سوانح نگار کو دانش مندی دیانت داری
> اور غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے۔ سوانح نگار اکثر ایسی شخصیتوں کو

موضوع قلم بناتا ہے جنھیں وہ جانتا پہچانتا ہے۔ یا جن سے عقیدت رکھتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹا، استاد شاگرد ہی نہیں کبھی کبھی مذہبی تعلق اور جاہ و حشمت کی خواہش بھی سوانح نگار کو قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔"(۵)

موضوع کے لحاظ سے سوانح کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو وہ جس میں سوانح کا ہیرو سوانح نگار کے دور کی شخصیت ہو کہ وہ اس سے براہِ راست معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح اس دور کے دیگر لوگوں سے بھی اس شخصیت کے متعلق معلومات حاصل کی جا سکتی ہوں اور دوسری قسم ایسی سوانح کی ہے جس کا ہیرو سوانح نگار سے زمانے کے لحاظ سے قربت نہ رکھتا ہو اور اس کے لیے معلومات کی چھان بین اور دیگر کتب ورسائل سے معلومات کو اکٹھا کیا گیا ہو۔

ب۔ حالاتِ زندگی سے واقفیت

سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ جس شخصیت کی سوانح لکھی جا رہی ہے اس کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کی تفاصیل سے آگاہی ہو۔ جہاں سوانح نگار اپنے موضوع سے پوری طرح آگاہ ہو وہاں وہ جس شخص کی سوانح عمری ترتیب دے رہا ہے اس کے ساتھ اس کا قریبی رابطہ رہا ہو یا اس کا مطالعہ اس طرح کیا ہو کہ اس کے حوالے سے تمام پہلوؤں سے کماحقہ آشنائی ہو اگر وہ شخصیت اسی دور میں موجود ہو تو خود اس سے یا پھر قریب ترین لوگوں سے معلومات اکٹھی کی جائیں اور بعدِ زمانہ کی صورت میں صاحبِ سوانح کی ذاتی زندگی کی معلومات کے ساتھ اس کے دورِ حیات میں اس کے گرد و پیش کے عوامل اس دور کی خوبیوں خامیوں اور تاریخ سے کماحقہ واقفیت ہو ورنہ سوانح میں معیار نہیں آئے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ سوانح نگار کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس شخص کے پورے عہد کا مکمل شعور رکھتا ہو۔ خواہ وہ کتنا ہی قد آور اور عام سماجی اور معاشرتی سطح سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اسی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے جس میں اس نے زندگی بتائی ہے اور اسے قدم قدم پر اپنے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اس لیے سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ اس معاشرے کی تہذیبی اور فکری سطح سے مکمل آگاہ ہوں ورنہ زیرِ ترتیب سوانح عمری سے انصاف نہیں کر سکے گا۔

ج۔ واقعات کا انتخاب

ایک تو یہ بات کہ کن واقعات کو شامل کرنا لازمی ہے یا اہمیت کو دیکھتے ہوئے واقعات کو چناؤ از حد ضروری ہے۔ ہر بات کا تذکرہ بھی ضروری نہیں اور بعض اوقات ایسے واقعات ہوتے ہیں جن سے پہلو تہی کرنے سے سوانح کا حسن مجروح ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری واقعات سے صرفِ نظر یا غیر اہم باتوں کی شمولیت سوانح کا حسن مجروح کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جن مآخذ سے معلومات یا مواد اخذ کی جائیں گی وہ کس حد تک مستند ہیں یا وہ قابلِ اعتبار ہیں یا نہیں۔ علاوہ ازیں اس بات کا خیال رکھنا کہ کس ماخذ سے کس واقعے کی بہتر انداز میں تفصیل فراہم کی جاسکتی ہے۔

د۔ مواد کی فراہمی

مواد کی فراہمی درج ذیل ذرائع سے ممکن بنائی جاتی ہے۔

ڈائری ، خطوط، انٹرویو، دوست احباب، سرکاری ریکاڈ، پہلے سے لکھی گئی سوانح عمریاں ، آپ بیتی وغیرہ

ڈائری: ڈائری میں روزمرہ کے معمولات کو لکھا جاتا ہے اور کیونکہ وہ صاحب سوانح کی اپنی تحریر ہوتی ہے لہٰذا بلاشک و شبہ اسے مستند ذریعے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے اس شخصیت کی تصویر کا درست عکس دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اس کی شخصیت کے چھوٹے چھوٹے معاملات کے حوالے سے نقش سامنے لاتی ہے۔

خطوط: مکتوبات کے ذریعے بھی انسان کے معاملات کا اور دوسروں سے برتاؤ کا احوال معلوم ہوتا ہے۔ سوانح کے لیے دستیاب خطوط سے مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ خطوط بہت سے واقعات کے لیے مستند ترین مآخذ ثابت ہو سکتے ہیں۔

انٹرویو: انٹرویوز کے ذریعے شخصیت کے نظریات اور خیالات کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے جو انٹرویو اخبار یا دیگر ذرائع سے دستیاب ہوں ان سے مواد مل جاتا ہے جو مستند ہوتا ہے۔ اگر صاحب سوانح زندہ شخصیت ہو تو اس کا خود انٹرویو لیا جا سکتا ہے ورنہ پہلے سے موجود انٹرویوز سے مواد لیا جا سکتا ہے۔

رشتہ دار، دوست: انسان کی عادات و اطوار کے متعلق سب سے بہتر اس کے گھر والے اور دوست بتا سکتے ہیں۔ اور اوائل عمر کے واقعات و حالات کے لیے بہترین مآخذ ثابت ہوتے ہیں۔

پیشتر لکھی گئی سوانح عمریاں: پہلے سے موجود سوانح سے مواد لیا جاسکتا ہے بعض اوقات کسی اہم پہلو یا واقعے کی طرف دھیان کسی اور سوانح نگار کی تحریر کے ذریعے جاتا ہے اس طرح نئی سوانح میں وہ پہلو سود مند ثابت ہوتا ہے۔

آپ بیتی: ڈائری کی طرح خود نوشت بھی اہم حوالوں سے انتہائی سود مند ہو سکتی ہے۔ اگر اس موضوع شخصیت نے خود اپنی سوانح تحریر کی ہو تو اسے ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔ ساتھ ہی سوانح نگار کو مواد کے سلسلے میں انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے:

> "مواد کی اہمیت بھی پیش نظر ہونی چاہیے۔ مواد کے مختلف ماخذ ہوتے ہیں۔ خود نوشت تحریریں، روزنامچے، یادداشتیں، خطوط اور اسی نوع کی دیگر تحریروں کا شمار بھی اس ذیل میں کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا ذریعہ اس کے اقوال و اعمال، گفتار و کردار یا لطائف و ظرائف وغیرہ ہیں۔ تیسرا ماخذ احباب، معاصرین، اخبارات اور رسائل وغیرہ ہیں اس کے علاوہ ذاتی معلومات بھی اہمیت رکھتی ہیں۔"(۶)

سوانح نگار کو جس قسم کا مواد فراہم کیا جائے گا سوانح عمری کا معیار بھی اسی پائے کا ہو گا۔

ہ۔ حسنِ ترتیب

مواد کی جمع آوری کے بعد کا مرحلہ ترتیب سے اس مواد کی پیشکش ہے یعنی جو زندگی کا فطری تسلسل ہے پیدائش سے جوانی اور پھر موت تک اسی ترتیب سے پیش کرنا تاآنکہ صاحبِ سوانح کی تصویر کشی بھی ہو اور اس کے رنگ بھی واضح ہو جائیں یعنی کس کس واقعے یا کن حالات نے اس کی شخصیت کو سنوارنے یا اس کی عادات کی تشکیل میں کردار ادا کیا۔ اس کے داخلی اور خارجی حالات کو اس طرح پیش کرنا کہ صاحبِ سوانح کی شخصیت کی پرتیں کھل جائیں۔ اس طرح ترتیب وار بیان سوانح کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

ک۔ غیر جانبداری یا انصاف

سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ شخصیت کو جوں کا توں پیش کرے نہ اپنی طرف سے کچھ بڑھائے نہ گھٹائے تاہم بعض دانشوروں کے خیال میں جن چیزوں کی تشہیر اس شخصیت نے اپنی زندگی میں خود نہ کی ہو اس کی وفات کے بعد یا اس کی اجازت کے بغیر ان چیزوں کو منظرِ عام پر لانا ایک قسم کی بد دیانتی ہے۔ تاہم کسی کے عیوب اور محاسن میں اعتدال پسندی اور منصفانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے تحریر کردہ سوانح اپنا معیار برقرار رکھتی ہے۔ یعنی ممدوح کو انسانی حیثیت میں رہتے ہوئے اس کے اوصاف کو قلم بند کرنا چاہیے۔

ل۔ اسلوب

اگرچہ سوانح غیر افسانوی صنفِ ادب ہے تاہم سوانح کو زبان و بیان کا ایسا انداز اپنانا چاہیے جو اس سوانح کو پر لطف بنائے، سوانح کا بنیادی مقصد اگرچہ معلومات کی فراہمی ہے لیکن جمالیاتی ذوق کی تشفی کا سامان بھی ہونا چاہیے۔ زبان و بیان پر قدرت سوانح کی پیشکش کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ اور قاری کے ذہن کو ایک تسلسل سے مرکوز رکھنا بھی لکھاری کا کمال ہوتا ہے۔

م۔ اثر پذیری

سوانح نگاری کو یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ جس شخصیت کی زندگی کے حالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جا رہا ہے کیا اس شخصیت کے حوالے سے ان معلومات کو پیش کرنے سے اس کے قارئین کو کسی طرح کا فائدہ پہنچتا ہے یا کس انداز سے اس کو پیش کیا گیا یہ بات بجائے خود کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

سوانح لکھتے وقت کسی فرد کی خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ داخلی پہلوؤں کو بھی شاملِ تحریر کرنا چاہیے اور اس کی شخصیت و پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے شخصیت کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کو بھی احاطۂ تحریر میں لانا چاہیے۔ یعنی سوانح نگار کو چاہیے کہ شخصیت کا ظاہر اور باطن متوازن انداز سے قارئین تک پہنچائے۔

۴۔ اردو سوانح نگاری کی مختصر روایت

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت اردو زبان و ادب کے آغاز ہی سے موجود تھی۔ اردو نے دیگر اصناف کی طرح اس صنف میں بھی عربی اور فارسی کی پیروی کی۔ اسلام کی آمد سے قبل عربی میں ایک مشہور کتاب "الاکلیل" ہے جس میں بادشاہوں اور حکمرانوں کے تذکرے ہیں۔ تذکرہ نگاری ایک طرح کی اجتماعی سوانح نگاری کی صورت تھی۔ بیاضوں اور تذکروں کی صورت میں کئی شخصیات کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے تذکرہ نگاری کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے درج ذیل محرکات گنوائے ہیں:

"ا۔ بقائے نام کی آرزو

ب۔ ارباب کمال کی قدر شناسی

ج۔ ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین

د۔ تاریخی شعور

ہ۔ رقابت اور معاصرانہ چشمکیں

و۔ ادبی گروہ بندی

ز۔ احباب واعزہ کی فرمائشیں

ح۔ سرپرستوں کی خوشنودی

ط۔ مشاعروں کی گرم بازاری

ی۔ پسندیدہ کلام کو باقاعدہ نظم و ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا شوق"(۷)

لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سوانح نگاری کا کام تاریخ نویسی سے بہت الگ ہے۔ تاریخ نویس واقعات کو نتائج کی سمت میں لے کر چلتا ہے جبکہ سوانح نگار کے لیے ہر واقع اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

" سوانح نگار کا موضوع شخص ہوتا ہے اور موت کا موضوع امر واقعہ۔ سوانح نگار زمانہ سے زیادہ انسان کو اہمیت دیتا ہے اور مورخ انسان سے زیادہ زمانہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ سوانح نگار زمانے سے اتنی ہی بحث کرتا ہے جتنی کہ ایک فرد کی تصویر کے لیے ضروری ہے۔ ایک مورخ افراد کی بحث میں صرف اس حد تک جاتا ہے جب تک کہ زمانے کی تاریخ اسے اجازت دیتی ہے۔ سوانح نگار کا ذہن دائرے سے مرکز کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور مونرخ کا ذہن مرکز سے دائرے کی طرف پھیلتا ہے۔"(۸)

سوانح نگار ثبوت کے بغیر نہیں چل سکتا اور اس کے لیے مواد کے مستند ہونے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ غیر جانبدار بھی نہ ہو اور اس کے پاس مواد بھی مستند نہ ہو تو ایسا سوانح نگار فن کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہر گز نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح خود نوشت یا آپ بیتی بھی سوانح عمری کی ایک ایسی قسم ہے جو ہمیشہ سے مشہور رہی ہے۔ روزنامے، یادداشتیں، مکاتیب اور سفر نامے دراصل خود نوشت کا خام مواد ہوتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ مواد کے استناد پر شک رہتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صاحب سوانح اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنی خامیوں پر دانستہ پردہ ڈالے یا دوسروں پر اپنی شخصیت کی برتری ثابت کرنے کے لیے واقعات میں افسانوی رنگ بھر دے۔ تاہم اکثر عظیم لوگوں کی زندگی کا بیشتر حصہ عوام و خواص کے علم میں ہوتا ہے اور شخصیت کی عظمت بھی بسا اوقات انھیں بلا تامل سچ بولنے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ اور بعض اوقات یہی سچائی کی صفت خود نوشت کا درجہ سوانح سے کہیں زیادہ بڑھا دیتی ہے۔

یہ تذکرے تاریخی، عمرانی، سماجی اور ادبی لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل تھے کیوں کہ ان سے قدماء کے متعلق بیش بہا معلومات کی دستیابی ممکن ہوئی۔ میر تقی میر، میر حسن اور شیفتہ خود تذکرہ نگار تھے۔ ان شاعروں نے اپنے علاوہ دیگر شعراء کے کلام کو پیش کرتے ہوئے ان شعراء کے حالات زندگی کو بھی شامل کیا اور بعض کی چال ڈھال اور اخلاق و اطوار کے متعلق تحریر بھی کیا اور اپنی رائے بھی دی۔ آگے چل کر آبِ حیات جیسے نمونے بھی اسی تتبع میں سامنے آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری بھی اپنا دائرہ کار بڑھاتی رہی۔

نصرتی نے علی نامہ تحریر کیا جس کو اردو سوانح نگاری کا اولین نقش کہا جاتا ہے۔ علی نامہ منظوم سوانح تھی جس میں تاریخی پس منظر اور اس وقت کے حالات کو بڑے متناسب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس دور کی ایک اور سوانحی دستاویز کی شکل میں ایک مثنوی بھی موجود ہے "غوث نامہ"، جس کو رومی نے تحریر کیا۔ اس کے علاوہ مولود نامہ عبدالملک، دریا نامی ایک مصنف کے دو وفات نامہ ملتے ہیں۔ یہ خالصتاً سوانحی تصانیف نہیں تھیں بلکہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سوانح نگاری کے عناصر موجود تھے اور سترھویں صدی میں اردو میں سوانح کے ابتدائی عناصر اور وہ بھی زیادہ تر منظومات کی شکل میں ملتے ہیں جن کی ترقی یافتہ شکل اٹھارویں صدی میں سامنے آئی۔

اردو میں سوانح نگاری ۱۸۸ اردو میں سرسید احمد خان کے زمانے میں جہاں اردو کو علمی مقاصد میں استعمال کیا جانے لگا وہیں سوانح عمریاں بھی اسی دور میں وجود میں آئیں۔ اردو میں اولین سوانح نگاری کی ابتدا کا سہرا مولانا الطاف حسین حالی کے سر ہے جن کی تحریر "حیاتِ جاوید" کو اردو کی پہلی باضابطہ اور باقاعدہ سوانح کا درجہ حاصل ہے اگرچہ اس سے پہلے "حیاتِ سعدی" اور "یادگارِ غالب" جو کہ بالترتیب شیخ سعدی اور اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمریاں تھیں تاہم جدید تقاضوں سے ہم آہنگ "حیاتِ جاوید" ہی کو کہا جاتا ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' میں مغرب میں تحریر ہونے والی سوانح عمریوں کی تکنیک کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

> "بلاشبہ حیاتِ جاوید میں خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں، اس کے باوجود حالی کا ذخیرہ سوانح عمری قابلِ ستائش اور بہت سے مابعد سوانح نگاروں کے لئے لائقِ رشک ہے۔ جو کچھ وہ نہیں کر سکے اس کے لئے انہیں معذور سمجھنا چاہیے۔[۹]

حیاتِ جاوید میں حالی نے شخصیت کو تاثر کو ہر جگہ قائم رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس پر سب سے زیادہ اعتراضات شبلی نعمانی کو تھے اور انھوں نے اسے "مدلل مداحی" اور "کتاب المناقب" بھی قرار دیا تھا۔ حالی کے دور میں ان کے علاوہ مولانا شبلی خود بھی سوانح نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں انھوں نے ''سیرۃ

النبی ﷺ'' اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت پر ''الفاروق'' تصنیف کی تھیں ''الفاروق '' کے حوالے سے ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

"حیاتِ جاوید کے بعد جامعیت اور تکمیل وغیرہ کے لحاظ سے اردو کی نو تعمیری اور تجدیدی سوانح عمریوں میں اگر کسی کتاب کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ الفاروق ہے۔"(۱۰)

حالی و شبلی کے معاصرین میں نذیر احمد، چراغ علی ، ذکاء اللہ، او رعبد الحلیم شرر کے نام اہم ہیں۔ مولووی ذکاء اللہ کی اہم تصانیف میں '' تاریخِ ہندوستان'' اور ملکہ وکٹوریہ کی سوانح ''آئینِ قیصری'' شامل ہیں۔ حالی اور شبلی کے بعد جن لوگوں نے سوانح نگاری کی، انھوں نے ان دونوں سے استفادہ کیا۔ دار المصنفین کے سوانح نگاروں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

سید سلیمان ندوی نے "سیرت النبی ﷺ" کو مکمل کرنے کے علاوہ" حیاتِ مالک"،"سیرتِ عائشہؓ" اور" حیاتِ شبلی" تصنیف کیں۔ افتخار عالم کی ''حیات النذیر'' اکرام اللہ ندوی کی ''وقارِ حیات''، رئیس احمد جعفری کی ''سیرتِ محمد علی'' افضل حسین ثابت کی ''حیاتِ دبیر'' اور قاضی محمد عبد الغفار کی سوانح عمری ''آثار جمال الدین افغانی'' اس دور کی چند اہم سوانح عمریاں ہیں۔

"بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک اردو ادب میں سینکڑوں سوانح عمریاں وجود میں آ چکی تھیں۔ غالب کے تعلق سے تین اہم سوانحات، بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سامنے آئیں۔"(۱۱)

یادگارِ غالب از مولانا الطاف حسین حالی کے بعد غلام رسول مہر کی ''غالب'' شیخ محمد اکرم کی سوانح عمری ''غالب نامہ'' اور مالک رام کی ''ذکرِ غالب''۔ مالک رام کی تحقیقی کاوش ''ذکرِ غالب (۱۹۳۸ء)'' اپنے دور اور غالب کی سوانح عمریوں میں قابلِ ذکر سوانح ہے۔ سید عبد اللہ لکھتے ہیں کہ "بلاشبہ یہ ایک محققانہ، مسرت بخش، مختصر مگر جامع سوانح ہے۔(۱۲)

غلام رسول مہر کی سوانح عمری ''سیرت سید احمد شہید'' لکھی جو ایک اچھی سوانح حیات کے طور پر سامنے آئی۔ اس فن کی ترویج میں سربراہانِ ریاست اور ادباء کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ لیکن اس میں خامی یہ آئی کہ اگر کسی والیِ ریاست کی سوانح لکھی تو اس کی حیثیت مدح سرائی سے زیادہ نہیں ہو سکی۔ زیادہ تر اس کا مقصد سیاسی یا مالی فوائد حاصل کرنا ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام کے قریب ایسی سوانح عمریاں بھی ملتی ہیں جن میں "حیاتِ وکٹوریہ" از مرزا ارشد گورگانی (۱۸۹۷ء)، "ہمارا قیصر" از محبوب عالم (۱۹۰۲ء)، قاضی عزیز الدین کی "ذکرِ ولی عہد" (۱۹۰۵ء)، شاہ ایڈورڈ ہفتم قیصر ہند (۱۹۰۶ء) میں سامنے آتی ہیں۔

مذہبی شخصیات کے حوالے سے "شہادت نامہ" از حافظ انور علی (۱۸۹۶ء)، "بڑی سوانح عمری" از حافظ اللہ حافظ (۱۸۹۷ء)، "سیرت الشافعی" از مولوی نجم الدین سیوہاری (۱۸۹۹ء)، "زرتشت نامہ" از منشی ممد خلیل (۱۹۰۴)، "گرو نانک دیو" از لالہ دیارام (۱۹۰۴)، "سوانح مہاراجہ رام چندر جی" از ایم-اے-بی ہاپوڑی (۱۹۰۵ء) وغیرہ شامل ہیں۔

دیگر سوانح عمریاں جو بیسویں صدی کے آغاز سے سامنے آنا شروع ہوئیں ان میں "ملک عنبر" از شیخ چاند (۱۹۳۱ء)، "اکبر الہٰ آبادی" از طالب الہ آبادی (۱۹۲۸ء)، "صولت شیر شاہی" از سید احمد مرتضیٰ (۱۹۳۴ء)، مولانا محمد علی کی سوانح از خواجہ احمد عباس (۱۹۳۶)، "حیاتِ اجمل" از حکیم رشید احمد خاں (۱۹۳۷ء)، "سوانح سلطان صلاح الدین اعظم" از فصیح الدین احمد انصاری (۱۹۳۷ء)، "سرخ چین کا رہنما" از اسرار احمد آزاد (۱۹۴۴ء)، "عقیدت مندوں نے بھی بڑی شخصیات کی سوانح کو منظر عام پر لانے میں بہت کردار ادا کیا۔

ملا واحدی کی تحریر کردہ "سوانح عمری خواجہ حسن نظامی" (۱۹۵۷ء)، "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" از خلیق احمد نظامی (۱۹۶۴ء)، "حیات ذکر حسین" از خورشید مصطفیٰ رضوی (۱۹۶۹ء)، "حیاتِ سلیمان" از شاہ معین الدین احمد ندوی (۱۹۷۲ء)، "غالب اپنے آئینہ میں" از اختر صدیقی (۱۹۷۰ء)، "ساحر لدھیانوی" از کیفی اعظمی (۱۹۴۸ء)، "ایک تھا شاعر" از مظفر حنفی (۱۹۶۷ء)، "عرفانِ غالب" از آل احمد سرور (۱۹۷۳ء) بھی اردو سوانح نگاری کے فن میں قابلِ ذکر سوانح عمریوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان سوانح عمریوں میں رفتہ رفتہ جدید اصولوں کی پیروی ہونے لگی اور ان کی حیثیت مدح سے آگے بڑھ کر سوانح نگاری کے معیارات کو برتنے کی کوشش تک جا پہنچی۔ بعض شخصیات ایسی بھی ہیں جن کے حوالے سے متعدد سوانح عمریاں منظرِ عام پر آئیں جن میں سرِ فہرست علامہ محمد اقبال کا نام ہے ان کی سوانح حیات کے زمرے میں "ذکرِ اقبال" از عبدالمجید سالک (۱۹۵۵ء)، "ڈاکٹر عبد السلام خورشید کی ''سرگزشتِ اقبال''سید نذیر نیازی کی ''دانائے راز''محمد حنیف شاہد کی'' مفکرِ پاکستان''اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی''زندہ رود'' ، "سوانح اقبال" از طالب فارسی (۱۹۳۸)، "حیاتِ اقبال" از چراغ حسن حسرت (۱۹۳۸)، "سیرتِ اقبال" (محمد طاہر فاروقی ۱۹۳۹)، "اقبالِ کامل" (عبد السلام ندوی۱۹۴۸)، "ذکرِ اقبال (عبدالمجید سالک ۱۹۵۴)، "یادِ اقبال" (صابر کلوروی ۱۹۷۷)، "دانائے راز" (سید نذیر نیازی، ۱۹۷۹)، "محمد اقبال؛ایک ادبی سوانح حیات" (جگن ناتھ آزاد،۱۹۷۸) کیاور "مفکرِ پاکستان" از محمد حنیف شاہد (۱۹۸۲)، "حیاتِ اقبال" از ایس ناز، "سرگزشتِ اقبال" از ڈاکٹر عبد السلام خورشید، خالد نظیر صوفی کی تحریر کردہ "اقبال درونِ خانہ"، تذکرۂ اقبال، سید وحید الدین کی "روزگارِ فقیر" اور اقبال کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحریر کردہ سوانح "زندہ رود" اور دیگر کتب شامل ہیں۔

علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت کو سمجھنے کے لیے متعدد سوانح عمریوں کی ضرورت تھی کیونکہ کوئی سوانح نگار بھی ان کی شخصیت کو مکمل طور پر پیش کرنے میں ان کے شعر و نثر کے سارے کمالات کا احاطہ کرنے میں اتنی ضخیم سوانح تیار کرنے میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اقبال کے کلام کی طرح ان کی شخصیت کو بھی بہت مداحی حاصل ہوئی اور تنقیدی کتب کے ساتھ سوانحی کتب کا بھی قابل قدر ذخیرہ دستیاب ہو گیا۔

اقبال کے علاوہ فیض احمد فیض کے سوانحی حالات پر مبنی کتب میں فیض احمد فیض: شاعر اور شخص از ڈاکٹر آفتاب احمد، "فیض احمد فیض: شخصیت اور فن" از اشفاق حسین، "جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا" از صلاح الدین حیدر، "فیض فہمی"، "خونِ دل کی کشید" از مرزا ظفر الحسن، "پرورشِ لوح و قلم: فیض حیات و تخلیقات" از لڈمیلا وسیلیوا وغیرہ شامل ہیں۔

اسی طرح پروین شاکر کی سوانح پارہ پارہ از نصرت زہرا اور احمد فراز کی سوانح اشرف شاد نے احمد فراز بقلم خود کے عنوان سے تحریر کی ہے۔

خود نوشت سوانح عمری کی روایت کا آغاز انیسویں صدی کے آخری عشروں میں ہوا۔ ۱۸۸۶ء سے قبل یہ نہیں لکھی گئی۔ عبد الغفور نساخ اور جعفری تھانیسری کی خود نوشت ۱۸۸۶ء میں لکھی گئیں، پتمبر سنگھ اور منشی رجب علی خان کی خود نوشت کے علاوہ شہر بانو بیگم کی خود نوشت بعنوان ''بیتی کہانی'' مئی ۱۸۸۵ء میں لکھی گئی، یہ اردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریوں میں سے ایک ہے، اسے اردو کی اولین نسوانی خود نوشت کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

اول الذکر خود نوشتوں کے علاوہ بھی بڑی تعداد میں خود نوشت سوانح عمریاں منظرِ عام پر آئیں۔ ان میں زہرا داؤدی کی کتاب "گرداب کی شناوری" اور "لذتِ صحرا نوردی"، عصمت چغتائی کی "کتاب کاغذی ہے پیرہن"، ادا جعفری کی کتاب "جو رہی سو بے خبری رہی"، صوفیا انجم کی کتاب "یادوں کی دستک"، سعیدہ بانو کی کتاب "ڈگر سے ہٹ کر"، بیگم انیس قدوائی کی کتاب "غبارِ کارواں"، صالحہ عابد حسین کی کتاب "سلسلۂ روز و شب"، ثریا حسین کی کتاب "آب رودِ گنگا"، عذرا عباس کی کتاب ''میرا بچپن''، صغرہ مہدی کی کتاب "حکایتِ ہستی"، شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی کتاب "پردے سے پارلیمنٹ تک"، تہمینہ درانی کی کتاب "مینڈا سائیں" اور کشور ناہید کی کتاب "بُری عورت کی کتھا" انتہائی اہم خود نوشت سوانح عمریاں تسلیم کی جاتی ہیں۔

اردو کے معروف ادیب مشفق خواجہ کے مطابق ''اردو اگر کوئی آپ بیتی کہلانے کی مستحق ہے تو وہ خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی ہے''۔ لیکن بعض دیگر شخصیات نے بھی خوبصورت آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ ان میں سر سید اور ان کے رفیق علامہ شبلی نعمانی جن کی تحریر کردہ سوانح کا ذکر گزر چکا ہے، ان کے علاوہ راشد الخیری، ملا واحدی، ابو الحسن ندوی، کے علاوہ مختار مسعود، احسان دانش، ممتاز مفتی، حسین احمد مدنی، عبد المجید سالک، شاد عظیم آبادی، چودھری خلیق الزماں، نواب صدیق علی خان، فیروز خان نون، جوش ملیح آبادی، عبد الماجد دریا آبادی، مشتاق احمد یوسفی، مہندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مرزا ادیب،

حاذق الخیری، قدرت اللہ شہاب, رضا علی, زہرا داؤدی، آلِ احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں، یونس احمر، ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، مرزا محمد عسکری اور الحاج محمد زبیر کے نام شامل ہیں۔

سید رضا علی (۱۸۴۹-۱۸۸۰) کی "اعمال نامہ "بہترین اسلوب کے ساتھ الفاظ کے چناؤ کے حوالے سے اہم سمجھی جاتی ہے، "مشاہدات نواب ہوش یار" ہوش بلگرامی (۱۹۵۵-۱۸۹۴)کی، "ناقابل فراموش" از سردار دیوان سنگھ مفتون (۱۹۷۵-۱۸۹۰)، "سرگزشت" از سید ذوالفقار علی بخاری کو بھی اردو میں اہم سوانح عمری کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح بیسویں صدی کے اختتام تک سوانح عمریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

اردو زبان میں بعض دیگر زبانوں سے ترجمہ شدہ سوانح عمریاں بھی ملتی ہیں۔ انگریزی زبان کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے اور دیگر زبانوں سے زیادہ انگریزی سے اردو میں دیگر اصناف کی طرح سوانح عمریوں کے تراجم بھی شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ فارسی اور عربی اور دیگر زبانوں سے تراجم دستیاب ہیں۔ جن میں اہم سوانح عمریوں میں مہاتما گاندھی کی "تلاشِ حق" کا ترجمہ از سید عابد حسین (۱۹۲۵ء)، "میر کی آپ بیتی" کا ترجمہ از نثار احمد فاروقی (۱۹۵۷ء)، "ابراہام لنکن" مترجمہ حامد حسن قادری (۱۹۵۷ء)، "میں کیوں شرماؤں" از محمد حسن عسکری (۱۹۵۹ء)، راجندر پرشاد کا ترجمہ "اپنی کہانی" از گوپی ناتھ امن (۱۹۶۱ء)، "ببول کے پیڑ" از سٹیلے کارناؤ، مترجمہ گوپال متل (۱۹۶۶ء) اور دیگر شامل ہیں۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اردو میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ خودنوشت آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔ اگرچہ زیادہ تر سوانح عمریوں کی تحریر کے لیے سوانح نگاری کے علاوہ بھی کسی محرک کا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن ہر طرح کی سوانح کا وجود ادب کی نشوونما کے لیے بہت ضروری ہے۔ چاہے وہ کسی ذاتی تحریک کے زیر اثر لکھی گئی ہوں یا پھر اس کا محرک کوئی خارجی ہی ہو۔ اس طرح نہ صرف ادبی و علمی شخصیات کی سوانح عمریاں دستیاب ہیں بلکہ سیاسی مذہبی اور سائنس کے شعبے سے بھی کئی قابلِ ذکر لوگوں کی سوانح عمریاں سامنے آئیں۔ ان سوانح عمریوں کے اسلوب اور معلومات نے اس فن کو بہتر بنانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح نہ صرف اردو میں بلکہ دیگر زبانوں میں موجود سوانح عمریوں نے اردو لکھاریوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا اور عالمی ادب سے سوانح عمریوں کے تراجم بھی اردو میں سامنے آئے۔ اردو میں بہت سی زبانوں سے علمی اور ادبی ذخیرے کو منتقل کیا گیا تاہم سوانح عمریوں میں انگریزی زبان کو فوقیت حاصل رہی جس سے سب سے زیادہ اردو میں تراجم کیے گئے۔ جہاں اس طرح ترجمہ نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا وہاں ساتھ ساتھ سوانح نگاری کے ذخیرے میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ سوانح نگاری کا فن وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں سے گزرتا گیا۔

جو اصول وضوابط آغاز سے اردو کے علاوہ دیگر زبانوں اور خصوصاً انگریزی سوانح نگاری سے اردو میں در آئے ان کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی اور کہیں کہیں آزادی بھی ملتی ہے۔ تاہم اچھی سوانح عمری کے لیے ضروری ہے کہ وہ استناد، غیر جانبداری اور حقیقت نگاری کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر تحریر کی گئی ہو۔ سوانح نگاری چونکہ کسی شخصیت کے متعلق معلومات کی فراہمی میں بنیادی طور پر مستند ذرائع اور حقائق کی درست تصویر کشی کی مرہون ہے ادب کی کسی بھی صنف کی کسی بھی تحریر کو حتمی یا کامل تو نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ہے کہ معیار کے لحاظ اور اس کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی قابلِ ستائش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرہنگِ آصفیہ جلد دوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، صفحہ نمبر ۱۱۱

۲۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ سعدی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طبع دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۱

۳۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۰

۴۔ قراۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، مکتبہ اردو ادب، لاہور، جلد اول، ۱۹۷۷ء، ص ۳۷

۵۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء، رونق پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲

۶۔ ایضاً، ص ۳۰

۷۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵

۸۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، سرسید اور ان کے نامور رفقاء، لیتھو پریس، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۶

۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، تفہیم و تجزیہ، کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۸۳

۱۰۔ علی شاہ، ڈاکٹر، سید، اردو میں سوانح نگاری، کراچی، گلڈ پبلیشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۹۱

۱۱۔ گیان چند، ڈاکٹر، کھوج، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۲

۱۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، وجہی سے عبدالحق تک، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۶

باب سوم

مجوزہ کتب کا تقابلی مطالعہ

ا۔ پرورشِ لوح و قلم: فیض، حیات اور تخلیقات

لدمیلا وسیلیئوا، تعارف:

لدمیلا وسیلیوا ۲۳ مئی ۱۹۴۲ کو روس میں پیدا ہوئیں۔ انھیں اردو زبان و ادب میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ انھوں نے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی سے گریجوایشن کے بعد ۱۹۸۷ میں الطاف حسین حالی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فیض احمد فیض جب روس جاتے تو لدمیلا ان کی مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر کرتیں۔ انھوں نے علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے حوالے سے اردو اور روسی زبان میں بہت کام کیا اس کے علاوہ مرزا غالب اور میر مہدی مجروح کے کلام کو روسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب غبارِ خاطر میں سے منتخب خطوط اور جوگندر پال کے ناول نادید کا روسی ترجمہ کیا، وہ ماسکو یونیورسٹی اور رشیئن سٹیٹ یونیورسٹی آف ہیومینیٹیز میں اردو ادب کی استاد ہیں۔ فیض احمد فیض کی سوانح عمری کو ساقی فاروقی نے ابتدائی ابواب کو ترجمہ کیا جبکہ ان کے انتقال کے بعد اس سوانح کو ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے خود اردو زبان میں ترجمہ کیا اور اردو غزل کے حوالے سے ان کی تحقیقی کتاب "اردو غزل بحیثیت صنف کا آغاز اور تشکیل" کے عنوان سے روسی سے اردو زبان میں عامر سہیل نے ترجمہ کیا ہے۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انھیں ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ ۱۹۹۲ء میں جامعہ ہمدرد سے وثیقہ اعتراف، دوحہ، قطر میں ۱۹۹۴ء میں طلائی تمغا، اور حضرت امیر خسرو عالمی اردو اعزاز دیا گیا۔ ۲۰۰۰ء میں علی سردار جعفری ایوارڈ، لاس اینجلس، امریکا میں ۲۰۱۰ء میں قاضی شفیع محمد ایوارڈ، فخر اردو عالمی اعزاز اور اس کے علاوہ ۲۰۱۳ء میں فیض فاؤنڈیشن ٹرسٹ لاہور کی طرف سے انھیں فیض احمد فیض اعزاز دیا گیا ہے۔

پرورشِ لوح و قلم: فیض، حیات و تخلیقات:

تعارف و تجزیہ:

فیض احمد فیض کی سوانح کا روسی زبان سے اردو میں ترجمہ "پرورشِ لوح و قلم" کے عنوان سے ساقی فاروقی اور لدمیلا وسیلیوا نے شائع کیا۔ لدمیلا کی ذہانت، متانت اور معروضیت کو ہندوستان کے اہم نقاد شمیم حنفی اور روس کی مصنفہ ایوگینیا وانینا نے بھی بجاطور پر سراہا ہے۔ شمیم حنفی کے الفاظ میں: فیضؔ کو لدمیلا نے قریب سے دیکھا اور جانا ہے اور اُنھوں نے فیضؔ کا تمام کلام بہت توجّہ سے پڑھا ہے لیکن فیضؔ سے قربت کے باوجود اُن کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں۔ اِسی لیے اُن کے مطالعے میں رچی ہوئی سنجیدگی اور معروضیت ملتی ہے۔ اور اس کتاب کے صفحہ ۵ پر ایوگینیا وانینا کی رائے شامل ہے جس میں وہ کہتی ہیں کہ: اپنی کتاب کے ہیرو سے طویل عرصے تک واقفیت رکھنے اور اُن کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر ہونے کے باوجود مصنفہ نے جو سنجیدہ اور گہرا تخلیقی کام سرانجام دیا، وہ ہر لحاظ سے بالکل معروضی ثابت ہوتا ہے۔

ادارۂ شرقیات کی درخواست پر مصنفہ نے ۲۰۰۰ء میں اُردو ادب کے روس کے طالبعلموں کے لیے روسی زبان میں فیضؔ پر یہ کتاب تصنیف کی جس کی اشاعت روس میں ۲۰۰۲ء میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔

لدمیلا کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے اِس کتاب کے اُردو ترجمے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن حیدرآباد دکن کے روسی شناس اور ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے رُکن اُسامہ فاروقی کا خط موصول ہوا۔ خط میں اُنھوں نے کتاب کو سراہا اور ترجمے کی خواہش ظاہر کی۔ لدمیلا نے محض اس کو حوصلہ افزائی اور تحسین سمجھا مگر اس کے بعد ان کو حیدرآباد دکن سے پروفیسر مغنی تبسّم کا ماہنامہ "سب رس" موصول ہوا۔ اس میں کتاب کے باب اول کا ترجمہ شامل تھا۔ ۹ ابواب کا اردو ترجمہ ماہوار شائع ہوا تو اس کے بعد اسامہ فاروقی وفات پاگئے جس کے بعد لدمیلا نے خود باقی پانچ ابواب کا ترجمہ کیا۔

لدمیلا نے اپنی کتاب کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ پہلے نو اور آخری پانچ ابواب کے ترجمے کے ڈھنگ اور اسلوب میں کافی بڑا فرق نظر آئے گا۔

فیض کے متعلق معلومات و احوال کو ایک خاص ترتیب سے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ ابواب کا جائزہ ذیل میں پیش ہے:

باب ۱۔ افسانہ اور حقیقت : اس باب میں فیض کے والد سلطان محمد کے حالات درج ہیں جو کہ فیض کی پیدائش تک اس باب میں شامل کیے گئے ہیں۔ سلطان محمد کی شخصیت ان کا گاؤں سے لاہور اور پھر لاہور سے افغانستان تک سفر ، وہاں امیر افغانستان کے ساتھ روابط اور اس کے بعد محلاتی سازشوں سے ان کے لندن اور پھر سیالکوٹ تک کے اسفار کو اس باب میں بیان کیا گیا ہے۔

باب ۲۔ لڑکپن: اس باب میں ابتدائی تعلیم ، شعر کی طرف میلان مختلف محافلِ شعر میں شرکت اور پھر شعر گوئی کی ابتدا کے متعلق واقعات و معاملات کو شامل کیا گیا ہے۔

باب ۳۔ جوانی: گورنمنٹ کالج میں فیض کی گزران، صوفی تبسم سے تعلق ، اقبال پر فیض کی نظم اور مشاعروں میں فیض کی شمولیت کے علاوہ شعر سنانے کا انداز اس باب میں ہیں۔

باب ۴۔ آغازِ سفر: فیض امرتسر میں پھر سیاسی ماحول اور فیض کی کمیونزم سے آشنائی، ترقی پسند تحریک کا آغاز اور پھر فیض کی بین الاقوامی شہرت تک کے واقعات اس باب میں شامل ہیں۔

باب ۵۔ اپنے پرائے: اس میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے معلومات اور تحریک کے اتار چڑھاؤ کو شامل کیا گیا ہے۔

باب ۶: ایلس: فیض کی ایلس سے ملاقات باہمی دلچسپی ، شادی، کتاب کا انتساب اور ساس کے منتخب کردہ نام کلثوم سے ایلس کی ناپسندیدگی۔

باب ۷۔ نقشِ فریادی: کتاب کے عنوان اور غالب کے شعر کی تشریح، نقش فریادی کے پیش لفظ، ن۔م راشد کے تاثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ منظومات میں مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، رقیب سے، تنہائی کا مطالعہ کیا گیا ہے، غزل کو روایتی انداز اپنانے کی بات اور اشاعت کے بعد کے حالات اس باب میں شامل ہیں۔

باب ۸۔ فوج: فوج میں شمولیت، کپتان سے میجر اور میجر سے لیفٹیننٹ کرنل بننے تک کی کہانی، ایم بی ای خطاب کی حوالے سے تحریر، بیٹیوں کی پیدائش، شاعری میں تعطل، نظموں میں "سیاسی لیڈر کے نام"، "میرے ہمدم میرے دوست"، "اے دلِ بے تاب ٹھہر" اور "چند روز اور مری جان" کا مطالعہ، فیض کی فوج سے رخصت لینے کی خواہش، پاکستان ٹائمز میں شمولیت اور قیامِ پاکستان کے واقعات اس ذیل میں ہیں۔

باب ۹۔ راولپنڈی سازش کیس: نقش فریادی کے ۹ سال بعد لاہور میں فیض کے شب و روز اور جنرل اکبر خان اور دیگر کی ملاقات، ہنگامہ اور قید کی بات اس مصرعے پر ختم ہوتی ہے "اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے"

باب ۱۰۔ صلیبیں مرے دریچے میں: اس باب کے ابتدائی حصے کے ترجمے کے بعد ساقی فاروقی انتقال کر گئے تھے لہٰذا یہاں سے لدمیلا وسیلیسوا نے خود ترجمہ شروع کیا ہے۔ اس میں ایلس کی مالی و ذہنی تکالیف، فیض کی حیدر آباد جیل منتقلی، جیل میں شعر و شاعری، دستِ صبا کی اشاعت، قید میں اضافے کا فیصلہ، لاہور قلعہ قید، دستِ صبا کی پذیرائی اور مصنفہ کی رائے میں دستِ صبا، زنداں نامہ اور دستِ تہِ سنگ کی اشاعت کے بعد صفِ اول کے قلم کاروں میں فیض کا شمار ہونے لگا۔

باب ۱۱۔ اسیری کا کلام: اس باب میں دستِ صبا، زنداں نامہ کی ۷۵ تخلیقات کا مجموعی طور پر رنگ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کی غزل اور نظم میں مماثلت پر بات کی گئی ہے۔ غزل گوئی میں پروفیسر گوپی چند اور شمس الرحمان فاروقی کا تجزیہ شامل ہے۔

باب ۱۲۔ منٹگمری سے ماسکو تک: اس باب میں ۱۹۵۵ میں دلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس سے ۱۹۵۸ میں افروایشیائی مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے تاشقند روانگی اور واپسی پر فیض کی گرفتاری کی مختصر روداد، فیض کی تحریر کردہ فلم "جاگو ہوا سویرا" کی پذیرائی، دستِ تہِ سنگ کی اشاعت، لینن انعام کی وصولی، فیض کی کتاب "ہماری قومی ثقافت" کی اشاعت، لندن اور سوویت یونین میں فیض کی مصروفیت کا تذکرہ ہے۔

باب ۱۳۔ فیض اور سوویت یونین: فیض کی سوویت یونین میں پہچان اور پذیرائی ۱۹۵۶ سے شروع ہوا، ۱۹۶۲ میں فیض کے کلام کا ترجمہ ۱ لاکھ کاپیاں شائع ہوئیں، روس کے حوالے سے فیض کے صرف دو نظمیں لکھنے کا ذکر، مریم سلگانیک کا تذکرہ، فیض کی عوام میں مقبولیت کے چند واقعات کے علاوہ مصنفہ نے لکھا ہے کہ فیض نے "مہ و سال آشنائی" میں سوویت نظام کی صرف خوبیاں بتائی ہیں اور خامیوں سے صرفِ نظر کیا ہے۔

باب ۱۴: مرے دل مرے مسافر: شامِ شہر یاراں کی اشاعت، فیض کی وزارتِ ثقافت میں مشیر کے طور پر شمولیت، سقوطِ ڈھاکہ، سجاد ظہیر کی موت، فیض بطور مترجم، پیامِ مشرق کے منظوم ترجمے کی اشاعت، جلاوطنی، فلسطین میں قیام، لوٹس کے مدیرِ اعلیٰ کے طور پر کام، ماسکو میں قیام، لندن روانگی اور پھر پاکستان واپسی سے فیض کی وفات تک حالات و واقعات اس باب میں شامل ہیں۔

اس باب کے آخری حصے میں فیض کی کتب، سگریٹ کی نوشی کا معمول، اور آخری عمر کی شاعری میں ڈرامائی اور المیاتی کیفیت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس میں فیض کی چند نظموں مثلاً ہارٹ اٹیک، میرے ملنے والے، تنہائی، ہم تو مجبورِ وفا ہیں، تین آوازیں اور چند غزلوں کا جائزہ بھی شامل ہے۔ لدمیلا نے فیض کی کتب کو ان کی زندگی کا ناول اور مرے دل مرے مسافر کو آخری باب قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں فیض کی آخری عمر کی شاعری میں غم کی کیفیت برابر نظر آتی ہے تاہم کبھی کبھی رجائی آہنگ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے فیض کی شاعری کے مستقبل کو تابناک قرار دیتے ہوئے اختتام اس مصرعے پر کیا ہے: بیٹھے ہیں سہارا لیے شمعِ سحری کا۔

کتاب کے ہر باب میں ایک شعر سے دیا گیا ہے جس سے اس باب کی تفصیل کا کوئی باطنی ربط یا تعلق موجود ہے۔ پہلے باب سے آخری تک ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ لدمیلا نے معروضی طریق کار کو بھی برتا ہے اور ساتھ ساتھ فیض کی ابتداء سے آخر تک فکر کو بھی ایک خاص طریقے سے پیش کیا ہے۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> "اس کتاب کا مطالعہ و تجزیہ اس لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اسے
> ایک روسی اسکالر نے لکھا ہے اور روسی زبان میں لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ
> اس کا اپروچ، نظریہ اردو کے پروفیشنل ادیبوں اور نقادوں سے مختلف تو

ہو گا۔بقول جمیل جالبی اس میں بہت سی ایسی باتیں آگئی ہیں جو اردو
قارئین کے لیے نئی ہیں۔"(۱)

ساقی فاروقی کے انتقال کے بعد جہاں لدمیلا کے اپنے قلم سے ترجمہ شدہ مواد سامنے آتا ہے وہاں روانی اور تحریر میں پر کشش انداز پیدا ہو جاتا ہے۔لدمیلا نے ابتدا سے آخر تک ہر واقعے پر ذاتی تاثر بھی شامل کیا ہے۔کتاب کے آغاز میں ابتدائی کلمات کے بعد میں فیض کے والد سلطان محمد کے حالات ملتے ہیں ان شخصیت اور ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر بات کی ہے۔لدمیلا نے فیض کی تاریخ پیدائش میں فیض کے ایک خط سے استفادہ کیا ہے جو انھوں نے صہبا لکھنوی کے نام لکھا۔اس کے مطابق جائے پیدائش کالا قادر بتائی ہے۔اشفاق حسین نے اپنی کتاب "فیض ایک جائزہ" مطبوعہ ۱۹۷۷ میں کالا قادر کو فیض کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔فیض احمد فیض۔شخصیت اور فن کے نام سے اشفاق حسین کی کتاب مطبوعہ ۲۰۰۶ء میں بھی کالا قادر ہی جائے پیدائش قرار دی گئی ہے۔ڈاکٹر سید تقی عابدی کی "فیض فہمی" مطبوعہ ۲۰۱۱ میں بھی فیض کا مولد کالا قادر بتایا گیا ہے لیکن سید مظہر جمیل نے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے:

"ڈاکٹر لدمیلا کا مذکورہ بیان اس قیاس پر مبنیہے کہ فیض کی والدہ کا مائیکہ
بھی کالا قادر میں تھا۔اور وہ بھی مروجہ دستور کی طرح وضعِ حمل کے
لیے اپنے مائیکے گئی ہوں گی۔لیکن یہ قیاس بھی درست نہیں کیوں کہ
والدہ فیض کا تعلق سیالکوٹ کی تصیل "جسبڑ" سے تھا۔کالا قادر سے
نہیں۔"(۲)

اور اس کتاب یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بچپن میں جن کاموں پر فیض کو داد ملتی تھی جوانی میں بھی انھی چیزوں اور عادات نے ان کی شخصیت میں جاذبیت کو بر قرار رکھا اور والدین ان کی پرورش پر بہت توجہ دیتے تھے:

"باپ بھی منجھلے بیٹے کو کچھ کم وقت نہیں دیتے تھے شاید بڑے بیٹے سے
زیادہ دیتے رہے ہوں اور فیض پر ان کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔

سلطان محمد بچے کی دلچسپیوں پر بہت توجہ دیتے۔ انھیں گہرائی سے سمجھنے
کی کوشش کرتے اور سنجیدہ کاموں کے تعلق سے ان کی قدرتی
صلاحیتوں کو نشو و نما دینے میں ہر طرح سے مدد کرتے۔"(۳)

آئندہ سطور میں لدمیلا نے اس بات کو کہ فیض کی شخصیت پر ان کے والد اور والدہ دونوں نے گہرا اثر چھوڑا، ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

" صحیح ترین ادعا یہ ہو گا کہ بیٹے نے ورثے میں ماں کی نیک مزاجی پائی اور
باپ کی شاندار صلاحیتیں، ان میں بلاشبہ ایک حد تک باپ کی قسمت کے
دھنی ہونے ہونے کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔"(۴)

اور لڑکپن میں ان کے مطالعے کی عادت، مختلف زبانوں میں ان کی دلچسپی اور والد کے مشورے پر انگریزی ادب کی طرف رجحان کی بات کرتے ہوئے انھوں نے نظم "رنگ ہے دل کا مرے" جو کہ ۱۹۶۳ کی تخلیق ہے، اس کو بھی اسی باب میں شامل کیا ہے اور ساتھ ہی لکھا ہے:

"جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظم میں آسمان اور کائنات کے وہی رنگ
جگمگا رہے ہیں جنھوں نے کبھی اپنی بوقلمونی اور تغیر پذیری سے اس
سادہ دل لڑکے کو اتنا متاثر کیا تھا۔ فیض کی صلاحیت کچھ عرصے بعد بیدار
ہونی شروع ہوئی جب انھوں نے کلاسیکی شاعری کی طلسماتی دنیا اپنے لیے
دریافت کی۔ تب وہ دسویں جماعت میں تھے"(۵)

انھوں نے فیض کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات میں پیدائش اور بچپن کے واقعات نقل کرتے ہوئے ان کی طبیعت پر والدین کے اثر کو بہت نمایاں قرار دیا ہے۔ سکول کے زمانے میں لدمیلا نے فیض کی طبیعت میں آرٹ کی طرف رجحان اور ان میں ڈرامہ بینی کے شوق کا ذکر کیا ہے:

"سکول کے زمانے سے وہ ناٹک دیکھنے کے بے حد شوقین تھے۔ لاہور اور
دلی سے یہاں تک کہ دور دراز بمبئی سے بھی ناٹک منڈلیاں اکثر سیالکوٹ

آتی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ جب بھی یہ اسٹیج رکھیلے جاتے تماش بینوں کی بڑی تعداد اکٹھا ہوتی۔ فیض اپنے سکول کے دوستوں کے ساتھ رات گئے تک انھی تماشوں میں غائب رہتے۔ تھیٹر سے لڑکپن کے دنوں کی دلچسپی بعد میں ڈراما نگاری کے بے حد شوق میں تبدیل ہوئی۔"(۶)

اسی طرح لدمیلا نے جوانی کے دنوں میں فیض کی طبیعت میں شرمیلے پن میں کمی کا ذکر کیا ہے اور ان کے حلقہ احباب میں وسعت کو ایک بڑی تبدیلی گردانا ہے۔ اور اسی طرح فیض کی اقبال کے حضور پیش کردہ نظم کا ذکر کرتے ہوئے فیض اور اقبال کے رشتے کو اقبال اور حالی کے تعلق کے مماثل قرار دیا ہے۔ فکری اور نظریاتی اعتبار سے اقبال اور فیض میں رشتہ موجود تھا لیکن فیض بعد میں اشتراکیت کی طرف رجحان کرتے گئے اور اقبال کے ہاں یہ چیز محدود تھی اور اس کے ساتھ ہی اقبال مکمل طور پر اسلام کو مسائلِ انسانی کا حل سمجھتے تھے۔ لیکن اقبال کی انسان دوستی اور، اخلاق پسندی حرکت و عمل اور ایسے دیگر مشترکہ نظریات ضرور تھے جن میں فیض اقبال کے قریب تھے۔ اس کے بعد فیض کے پہلے عشق میں ناکامی کا ذکر بھی کیا ہے جو انھوں نے فیض کی نظم "ایک رہگزر پر" اور "تین منظر" کے اشعار سے اندازے کے ساتھ پیش کیا کہ اس لڑکی کی کہیں اور شادی کر دی گئی اور محبت یکطرفہ نہیں تھی۔ فیض کی شاعری میں سوشلسٹ نظریات کی درآمد اور فیض کے موضوعات کے متعلق لدمیلا نے لکھا ہے:

"تنہائی اور انتظار کے موضوعات جنھیں تیس کی دہائی میں فیض نے اکثر برتا ہے ان کے سبھی شعری مجموعوں میں مل جائیں گے۔ ہمارے شاعر کا میلان بعد میں بھی چند موضوعات کی طرف برقرار رہے گا جو پہلی بار ان کی تخلیقات میں منظر عام پر آئے مثلاً سویرے رات، رہگزر، بادصبا، سرود اور ورودِ غم۔"(۷)

لدمیلا نے امرت سر کی مصروفیات کو فیض کی آئندہ شاعری اور نظریاتی رجحان کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل قرار دیا ہے۔ پھر لکھنو میں پریم چند کے خطبے کا اثر کہ جس کے بعد فیض نے اس سے متاثر ہو کر

بہت سے اشعار لکھے اور اپنے مضامین میں بھی پریم چند کا کئی بار حوالہ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے امرتسر میں ۱۹۳۸ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے حوالے سے لکھا ہے:

> " ۱۹۳۸ء میں امرتسر میں انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کی ایک ایسی کانفرنس کے انعقاد کا دلچسپ تذکرہ سجاد ظہیر نے کیا ہے جس کے بعد ایک مشاعرے کا بھی انتظام تھا۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ مشاعرہ سبھی ادبی سرگرمیوں کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا اس کانفرنس کے انتظام کی ساری ذمے داری فیض کے سر تھی اس میں شرکت کے لیے پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش، مجاز، جاں نثار اختر، کرشن چندر، جذبی، مخدوم اور سبط حسن آئے تھے۔ "(۸)

سوانح نگار کو ان ناموں میں پریم چند کو شامل کرنے میں مغالطہ ہوا کیونکہ پریم چند کی وفات ۱۹۳۶ء میں بنارس میں ہوئی اور یہ کانفرنس دو برس بعد ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوئی تھی۔ لدمیلا نے فیض کی سوانح میں جابجا ان کے کلام پر بحث بھی کی ہے اور مختلف نظموں کو بہت تفصیل سے سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ بعض نظموں مثلاً "تنہائی"، "رقیب سے" اور "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" کو متعدد بار موضوع بحث بنایا ہے۔ دو ابواب "نقش فریادی" اور "اسیری کا کلام" تو فیض کی شاعری کو خاص طور پر موضوعِ تحریر بنا کر لکھے گئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ناقدین کی آراء پر بھی لدمیلا نے خود تبصرہ کیا ہے۔ مثلاً نقش فریادی کے دیباچے کے متعلق لکھتی ہیں:

> "شاعری کے باریک نظر قدر شناس اور ذہین نقاد راشد مجموعے کے ان دو حصوں کے نمایاں فرق کے بارے میں چپ لگا جانا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ بظاہر وہ حصہ دوم کے کلام میں ظہور پذیر ہونے والے فیض کے واضح ترقی پسندانہ موقف کی طرف قارئین کی توجہ مبذول نہیں کروانا چاہتے جبکہ فنکارانہ مہارت کے نقطہ نظر سے بھی وہ حصہ اول میں شامل فیض کے ابتدائی کلام کے مقابلے میں صریحاً اونچے درجے پر ہے۔ خود

شاعر کی توضیح کو نظر انداز کرتے ہوئے جان بوجھ کر ن م راشد مجموعے
کے سارے مشمولات کو ایک ہی معیار پر جانچتے ہیں"(۹)

دوسری طرف فیض کی صفات اور ان کے ذاتی حالات کا فیض پر اثر بھی لدمیلا نے اپنے انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فیض کو شرمیلا، کم گو اور زندگی سے بھرپور بھی دکھاتی ہیں اور دوسری طرف جیل کے دنوں میں، اور زندگی کے آخری برسوں میں مضمحل اور پریشان بھی، یہاں تک کہ فیض کو نرینہ اولاد نہ ہونے کا قلق بھی تھا۔ لدمیلا کے بقول:

"دراصل فیض کو عنایت اور اس کے رشتے داروں سے بے شک ہمدردی
ہوئی ہوگی جو لڑکا پیدا ہونے کی بڑی امید لگائے بیٹھے تھے۔ غالباً فیض بھی
خاص خوش نہیں تھے کہ ان کا بھی لڑکا نہیں ہے اگرچہ وہ ہمیشہ یہی کہتے
تھے کہ بیٹا ہو یا بیٹی ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، بچہ تندرست ہو
اور اچھا انسان بنے بس یہی ضروری ہے"(۱۰)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس فیض کے ایک خط کے حوالے سے لدمیلا کی رائے پر مشتمل ہے جو خط انھوں نے جیل سے ایلس کو لکھا تھا اور ممکن ہے فیض بیٹے کی کمی اس لیے محسوس کر رہے ہوں کہ اسیری کے دنوں میں ان کے مالی حالات دگرگوں تھے جس میں بیوی اور بیٹیاں پریشانی سے وقت گزار رہی تھیں۔ کیونکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس بات کا ذکر اپنی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں کیا ہے اور فیض احمد فیض نے جواب میں بتایا تھا کہ انھیں نرینہ اولاد سے محرومی کا کوئی دکھ نہیں، اس کا ذکر آئندہ سطور میں بھی آئے گا۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ لدمیلا کے مطابق فیض کا تخلیقی سفر چھ تخلیقات کی بنیاد پر پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے جن میں ایک نظم "تمھارے حسن کے نام" دو قطعات "مقامِ لوح و قلم" اور "دامنِ یوسف" اور چار غزلیات:

"ا۔ روش روش ہے وہی انتظار کا موسم"

"۲۔ تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے"

"۳۔ تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں"

"۴۔ شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام" شامل ہیں۔ لدمیلا نے "افسردگی" کو فیض کی شاعری کے مفہومِ زیریں کا ایک جزو لاینفک قرار دیا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے مطابق فیض کی شاعری کا ماحصل رجائیت ہے تاہم ان کا کلام اور فکر آغاز کی نسبت آخری دنوں میں ولولہ اور جوش کی کمی کا شکار نظر آتی ہے۔ فیض احمد فیض نے جس آئیڈیالوجی کو نصب العین بنالیا تھا اس کی ناکامی کا سامنا کرنا انھیں مشکل لگ رہا تھا۔ اس دور میں ان کے پیشِ نظر جو مثالیں تھیں وہ اپنی خامیوں کے باوجود ان کے لیے آئیڈیل کا درجہ رکھتی تھیں۔ فیض انسانیت کے دکھوں کا مداوا اسی نظام میں سمجھ رہے تھے اور مجبوراً ان کے لیے مشکل تھا کہ وہ عمر کے آخری حصے میں ان خوابوں کو مسمار ہوتا دیکھتے۔ لدمیلا وسیلیوا لکھتی ہیں:

> "آج مہ وسالِ آشنائی" کی ایک اہمیت تو یہی ہے کہ فیض احمد فیض کے قلم کی ایک یادگار ہے اور اِس ملک کی ایک جزوی تصویر ہے جو اَب نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اِس کتاب میں بہت سی اچھائیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جس پر سوویت یونین کو بجا طور پر فخر تھا لیکن اُن برائیوں کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا گیا جو کئی برس بعد، ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کی شکست و ریخت کا باعث بنیں۔ اِس لحاظ سے "خوبصورت پس منظر" اور "فن کار کی جادوئی رنگ آمیزی" پر آج تلخ تبصرے ہی کیے جاسکتے ہیں۔"(۱۱)

ان کے خیال میں فیض نے اپنی بصیرت سے دیکھ لیا تھا کہ آئندہ دنوں میں سوویت یونین کا خواب بکھرنے والا ہے اور یہ بات وہاں کے رہنے والوں سے بھی پیشتر فیض احمد فیض نے محسوس کر لی تھی جس کا اظہار ان کے شعروں میں جابجا ہونے لگ پڑا تھا۔ اس بات کو پروفیسر سہیل انصاری نے لدمیلا کی طرف سے خراجِ تحسین قرار دیا ہے۔ آخر میں لدمیلا نے فیض کی شاعری کے مستقبل کے متعلق لکھا ہے:

"فیضؔ نے بیسویں صدی کے اواخر میں وفات پائی۔ کیا اکیسویں صدی میں اِس منفرد شاعر کا کلام معروف اور مقبول رہے گا؟..... ہر نئی نسل شعرائے اسلاف کا کلام اپنے طریقے سے پڑھتی ہے۔ اِس کا اپنا ذوق اور اپنی ترجیحات ہوتی ہیں تو پھر فیضؔ کے شاعرانہ پیغام اور شعری پیکروں میں سموئے ہوئے اُن کے نظریات اور خیالات کے بارے میں قارئین کی نئی نسلیں کیا کہیں گی؟ فیض کے اشعار کو وہ کس طرح سمجھیں گے؟ اَب تو واضح ہو چکا ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی قدریں جو فیضؔ صاحب کے لیے اوّلین اہمیت رکھتی تھیں، تاریخ کی کسوٹی پر پوری نہیں اُتریں۔ افروایشیائی ادیبوں کی تحریک بھی جس کی حوصلہ افزائی کا اور ہر طرح کی مدد کا سرچشمہ اشتراکی نظام تھا، اِس نظام کی شکست کے ساتھ ہی ختم ہو گئی اور فیض احمد فیضؔ تو اِس تحریک کے ایک بانی اور راہنما تھے۔"(۱۲)

لدمیلا وسیلیوا نے فیض پر ایفروایشیائی تحریک کی کمزوری کا منفی اثر وضاحت سے لکھا ہے۔یعنی ان کے خیال میں فیض کی شخصیت میں اداسی اور غم کی کیفیات کا اضافہ جن واقعات سے ہوا ان میں یہ واقعہ بھی شامل ہے۔اس استدلال پر سید مظہر جمیل نے اختلافی نوٹ لکھا ہے:

"ڈاکٹر لدمیلا وسلیوا کے اس شخصی تاثر کے حق میں فیض کی کسی تحریر اور رویے سے یہ بات منکشف نہیں ہوتی کہ وہ ماسکو میں قیام کے دوران ایرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم اور اس کے جریدے کی بابت کسی قسم کی بدگمانیوں کا شکار تھے اور ان کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہوئے ہوں بلکہ اس کے برعکس جب ۱۹۸۳ء میں وطن واپس لوٹے ہیں تو انھوں نے پاکستان کے ترقی پسند ادیوں کے سامنے اردو میں اس کے پاکستانی ایڈیشن کی تجویز رکھی تھی اور لوگوں نے اصولاً ان کی تجویز کو منظور بھی کر لیا تھا۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ بیروت کے قیام کے دوران وہ ایک مرتبہ پھر شدید احساس تنہائی کا شکار ہو گئے تھے اور اب انھیں شدت سے گھر اور بچیاں یاد آنے لگی تھیں۔"(۱۳)

سوانح کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں سوانح نگار کی اپنی ذات تبصرہ نگاری کی صورت میں حاوی نظر آتی ہے اس کے علاوہ کچھ نظموں اور اشعار کی تکرار بھی تھوڑی دیر کے لیے توجہ کا تسلسل توڑ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کو ابواب میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ زمانی ترتیب کی بجائے کسی خاص پہلو کو شروع یا درمیان سے آخر تک بیان کیا گیا ہے۔ اس سوانح کے خاتمے کی طرف جاتے ہوئے قلم پر بھی اضمحلال کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اگرچہ سوانح نگار نے خود بھی اس بات کو محسوس کر کے یہ عندیہ بھی دیا ہے کہ وہ سوانح کو کسی قنوطی بات پر ختم نہیں کرنا چاہتیں:

> "اُن کو اس بات کا شدید احساس ہونے لگا کہ اُن کے نظریاتی نصب العین کی بنیاد اتنی مضبوط نہیں جتنی پہلے معلوم ہوتی تھی۔ بے شک اُن کے لیے یہ ایک بڑا ذاتی المیہ تھا۔ باالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اکیسویں صدی کے اوائل میں فیض احمد فیض کے آخری دور کے کلام میں جو سوالیہ یا شکّی لہجہ اور ڈرامائی اور کبھی المیاتی رنگ بھی نظر آتا ہے وہ بیسویں صدی کے اواخر کے عالم گیر تغیرات کا اور خاص طور سے اشتراکی نظام کی شکست کا مبہم سا عکس ہے۔ فیض کی شاعری پر گفتگو کسی قنوطی نقطے پر ختم کرنا قطعی ناجائز ہے کیونکہ آخری کچھ برسوں کا رنگ فیض کی شاعری کی بنیادی نمائندگی نہیں کرتا۔ فیض صاحب کی طبیعت میں رجائیت اور اُمید پسندی غالب تھیں۔"(۱۴)

ہر باب کے آخر میں مآخذ کے حوالہ جات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح لد میلا نے بہت حد تک ان معلومات کو مستند ذرائع سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں فیض کی زندگی کو آغاز سے ان کی وفات تک اور اپنے شہر سے دنیا بھر میں فیض کی مقبولیت پر کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔ فیض کے نظریات سے لیکر ان کے فن تک کی شرح، نجی زندگی سے بین الاقوامی امور تک بنیادی طور پر تقریباً ہر گوشے پر لد میلا نے روشنی ڈالی ہے۔ فیض کی شاعری پر نہ صرف ماہرانہ تبصرہ ملتا ہے بلکہ فیض کی شاعری کے کچھ خاص پہلو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لد میلا نے فیض کی شاعری میں غم اور رجائیت دونوں کے توازن کو تلاش کیا

ہے۔کتاب میں واقعات کی ترتیب اور تسلسل سے صاحب سوانح کی زندگی کا ایسا منظر نامہ سامنے آتا ہے کہ جس سے ان کے حالات کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی بھی بہت خوبصورتی سے ہوتی ہے۔ڈاکٹر لدمیلا نے روسی زبان میں یہ سوانح تحریر کی تھی اور اس کا اردو ترجمہ بھی خود پیش کیا جس کی روانی اور ترسیل سے قطعی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ غیر ملکی شخصیت کی تحریر ہے۔

۲۔ہم کہ ٹھہرے اجنبی

(الف)ڈاکٹر ایوب مرزا، تعارف

۲۱ مارچ ۱۹۲۹ کو میرپور، آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے اور ۱۵ اگست کو ۲۰۱۰ گلاسگو، سکاٹ لینڈ میں انتقال کیا۔وہ ڈیموکریٹک سٹوڈینٹس فیڈریشن کے اہم ترین ناموں میں سے تھے جنھوں نے انٹر کالجیٹ باڈی کے ساتھ مل کر سٹوڈنٹ موومنٹ چلائی یہاں تک ۱۹۵۳ میں ہر قسم کی ترقی پسند انہ سرگرمی پر حکومت کی طرف سے پابندی عائد کر دی گئی۔ان کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا اور سیاست سے ان کا تعلق راولپنڈی میں طالبعلمی کے زمانے سے پیدا ہوا۔انھوں نے نامور مارکسی کارکنوں عابد منٹو، ڈاکٹر ہارون رشید اور ڈاکٹر محمد سرور کے ساتھ بہت کام کیا اور ڈیموکریٹک سٹوڈنٹ فیڈریشن کا دفتر راولپنڈی میں کھولا اور اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔

طالبعلمی کے دور ہی میں انھوں نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔انھوں نے گریجوایشن میں بعد برطانیہ رہائش اختیار کر لی اور ۱۹۶۴ میں فیض احمد فیض کی خواہش پر وطن واپسی اختیار کی۔ان کی تحریر کردہ کتب میں فیض احمد فیض کی سوانح "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"، دادا امیر حیدر کی سوانح "دادا"، اردو نظموں کا مجموعہ "لہو میں دھنک"، "فیض نامہ" اور ایک خود نوشت سوانح "برگِ جہاں دیدہ" شامل ہیں۔

(ب)ہم کہ ٹھہرے اجنبی، تعارف و تجزیہ

یہ کتاب فیض کی زندگی میں ۱۹۷۷ میں لاہور سے شائع ہوئی۔اس میں بغیر عنوان کے ۳۲ الگ الگ ابواب شامل ہیں۔جن کے چیدہ چیدہ نکات ذیل میں درج ہیں:

۱۔ منیلا اور ہانگ کانگ کا سفر ، کلچر سے محبت اور جمع آوری کا شوق، مینارِ پاکستان، جیل کی یادیں، جیل میں درسِ قرآن۔

۲۔ فیض کی کارسازطبیعت اور راولپنڈی میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں جن میں ایک بات مشترکہ تھی کہ ان کی شادی میں فیض کا کردار تھا۔ اور وہ سب خوش تھے۔

۳۔ چکی میں پھنس کر فیض کی انگلی کٹنے کا واقعہ ، بچپن میں گاؤں کی محبتوں کا احساس اور پھر روس اور چین کے حالات پر فیض کے خیالات

۴۔ علامہ اقبال کی تحریر کردہ چٹھی، والد کا بچپن ان کی تعلیم کی لگن اور پھر افغانستان کا سفر ، دولت مندی سے زوال تک کی کہانی اور قرض کا بوجھ

۵۔ انگریز کی نوکری، فوج میں کام، جرمنی اور روس کے متعلق باتیں، فاشزم

۶۔ ایم بی ای ایوارڈ ، فوج کی ملازمت کے دوران اعلیٰ حکام کو مشورے ، انگریز کی طوطا چشمی، فوج سے رخصت، فاشزم

۷۔ فاشزم کے خلاف عملی جنگ میں شرکت، فوج سے علیحدگی اور لیکچرر شپ، پاکستان ٹائمز میں شمولیت اور رات گئے تک کام کے معمولات

۸۔ مولانا حسرت، ان کی فوج اور صحافت میں کارکردگی پر، امروز اور صوفی تبسم کی یادیں

۹۔ میزو (فیض کی صاحبزادی) سے فیض کے متعلق بات چیت جس میں وہ فیض کی طبیعت میں محبت اور بھولپن کی بات کرتی ہیں۔ کاکروچ سے خوف، فلم دیکھنے سے منع کرنے کا واقعہ اور ان پر فخر کرتی ہیں۔

۱۰۔ پطرس بخاری اور ان سے ملنے میں مشکلات، صوفی تبسم اور ان کی مہمان نوازی کی یادیں

۱۱۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک، بنیاد سے پابندی تک، احمد ندیم قاسمی کا خطبہ اور فیض کی ترقی پسند انجمن سے علیحدگی۔

۱۲۔ گورنر گورمانی سے ملاقات کا احوال، کراچی طلباء کے لیے سرِوادیِ سینامیں شامل سطریں، سی آئی ڈی کا پہرہ، جیل میں دانت درد کی وجہ سے تانگے کا سفر اور نظم "آج بازار میں پابجولاں چلو"۔ گاؤں کی زمین کا قضیہ

۱۳۔ چھمی (فیض کی صاحبزادی) سے فیض کے متعلق بات چیت۔ فیض کی دودھ سے پسندیدگی کا اظہار، نرم مزاجی، حساب میں کمزوری، سکول جانے میں نرمی، شادی یا تعلیم میں خرچ کے لیے پیسے دینے کا واقعہ اور جیل کے دنوں کے حالات پر گفتگو شامل ہے۔ اس میں چھمی کے الفاظ میں انھوں نے اپنے والد سے "Passion" سیکھا۔

۱۴۔ فیض کا مذہب، "چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" غزل سن کر سیٹھ کی کاروبار میں شرکت کی دعوت اور ایک سیٹھ کا فیض کو "مرجا گالب" یعنی مرزا غالب سمجھنا، ایک انجینئر کا فیض کو ترکِ سخن کا مشورہ

۱۵۔ جیل کی باتیں، روس اور چین کے متعلق گفتگو، طبقاتی شعور اور طبقاتی جدوجہد اور جمالیات کے درجے

۱۶۔ جنرل ایوب کا دور، منٹگمری میں "آج بازار میں پابجولاں چلو" اور لاہور قلعہ کا واقعہ۔ استاد دامن کی گرفتاری

۱۷۔ ۱۹۶۲ لندن میں اور ناٹنگھم میں مہمانِ خصوصی کے طور پر تقاریب میں شرکت، وطن واپسی پر گرفتاری، ناظم حکمت، سکارنو اور سپین کے انقلابی شاعر کا ذکر

۱۸۔ لوگوں کی بے عملی کی باتیں، فیض کی رسمِ نکاح کا احوال، ادھار پیسوں سے نکاح، نرینہ اولاد نہ ہونے پر کوئی افسوس نہ ہونا، اور بیٹی چھمی کی شادی کا ذکر

۱۹۔ ۱۹۶۵ کی جنگ کا ذکر، لوگوں کے رویوں میں اخلاص، فیض کی ۱۷ / ۱۸ دن جنگ کی پیشگوئی اور فیض کی نرم گوئی

۲۰۔ جنگ کی وجوہات، جنگ سے متاثرہ لوگوں کے حالات اور مذہب کا ذاتی مفادات کے لیے استعمال

۲۱۔ آرٹس کونسل کے کام کا آغاز، وقت کے ساتھ بددلی اور چیئرمین شپ کا خاتمہ

۲۲۔ پنجابی شاعری میں صوفیاء کا مقام، رباسچیا نظم، جالب کا ذکر اور فیض کی دستار بندی

۲۳۔ حذر کرو میرے تن سے، کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے اور مشرقی پاکستان کا المیہ

۲۴۔ بنگلہ دیش کا دورہ، مایوسی، نظم "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"

۲۵۔ روس کا سفر، ہسپتال میں طبی سہولیات، نظم "اشک آباد کے نیلے افق پر"، کشمیری عورت کی خوبصورتی

۲۶۔ جنگ اور بقائے باہمی کا اصول، استاد دامن کی گرفتاری، "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" اور آجاؤ ایفریقہ"

۲۷۔ شعر کیا ہے، اچھا شاعر کون ہے، گیت کی روایت، نثری نظم کی بے ہودگی، غالب جیسا لکھنا ممکن ہے وارث شاہ جیسا لکھنا ناممکن ہے۔ غالب کے بعد اقبال سب سے بڑے غزل گو ہیں۔

۲۸۔ صادقین کی بیماری، پنڈت ہری چند اختر، نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"

۲۹۔ کلچر اور اس کی جہات، قومیت، کون سی موسیقی حرام ہے

۳۰۔ میکسم گورکی، عوام میں مقبول گلوکاری، جوش ملیح آبادی

۳۱۔ فلسفہ کا شوق، کارل مارکس، مادہ پرستی اور مادی قوت میں فرق، سارتر سے ملاقات اور وجودیت، فاشزم کا انجام

۳۲۔ عشق کا تجربہ، علامہ اقبال سے ملاقات اور فیض کے اس حوالے سے تاثرات، آئی سی ایس کا امتحان، کیمونسٹ مینی فیسٹو سے شناسائی، کرنل بننے کے بعد پاکستان ٹائمز کی ذمہ داری، سیاست اور سوشلزم کا اثر، فیض پر امید تھے کہ وہ منزل آجائے گی۔

اس کتاب میں مکالماتی رنگ اختیار کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے کبھی فیض کی زبانی اور کبھی اپنے الفاظ میں سوال و جواب کی صورت میں فیض کے خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اگرچہ سوانحی حالات کو فیض کی زبانی بیان کروا کے کئی حوالوں سے معلومات قاری تک پہنچائی ہیں مگر ان کا جھکاؤ فیض کے نظریات اور فن کی طرف زیادہ رہا۔ شخصیت پر بھی ڈاکٹر ایوب مرزا نے خود جہاں مناسب سمجھا اپنے الفاظ یا پھر فیض کی دونوں صاحبزادیوں کی زبانی فیض کے اخلاق و عادات کو مختصراً شامل کیا ہے۔ اس کتاب میں کسی زمانی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر محض سوال و جواب کا ایک سلسلہ جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔

فیض کے مذہب کے متعلق واقعے کو جس میں انھوں نے مولانا روم کو اپنا ہم مذہب قرار دیا تھا، اس کے فوراًبعد چند ایسی ملاقاتوں کا ذکر ہے جس میں فیض کا ایک الگ روپ نظر آتا ہے جس میں وہ ان لوگوں کے ہاں جاتے ہیں جن سب کی شادیوں میں فیض کا کردار رہا اور وہ ان سے بعد کے روز و شب میں خیریت دریافت کرنے جاتے ہیں:

> "فیض صاحب کمال کے شاعر اور وغیرہ وغیرہ ہونے کے علاوہ نیایت کمال کے کارساز بھی ہیں۔ ان کا ایک وسیع حلقہ ایسے خوش نصیبوں کا ہے جن کی نیا انھوں نے خوش اسلوبی سے پار لگائی ہے اور انھوں نے کئی لوگوں کے نصب کو چار چاند لگائے ہیں اور بگڑی بنانے میں تو انھیں خوب مہارت حاصل ہے۔"(۱۵)

فیض سے فاشزم اور سوشلزم پر طویل بحث و مباحثہ اس کتاب میں شامل ہے۔ جس میں بعض جگہوں پر ڈاکٹر ایوب مرزا نے سوال کی بجائے اپنی رائے کو بہت طوالت کے ساتھ بیان کیا اور اس پر فیض کی رائے کو شامل کیا ہے۔ ان کی سیاست اور دیگر ملکی امور پر سوچ کو اسی طریقے سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شخصیت سے زیادہ نظریات و خیالات سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں اس سوانح پر قراۃ العین حیدر کے تبصرے کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ قراۃ العین حیدر نے لکھا ہے کہ ۱۹۷۷

> " میں ایک کتاب چھپی 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی' جس کا عنوان دراصل 'ملفوظات حضرت فیض شاہ، جہاں دوست ہونا چاہیے تھا۔"(۱۶)

لیکن جہاں فیض سے دنیا کے مختلف معاملات پر رائے لی گئی ہے وہیں بعض جگہوں پر ان کی شخصیت اور زندگی کے مختلف واقعات کا ذکر بھی آتا رہا ہے۔ اپنے والد کے متعلق اور ان کی نشیب و فراز سے بھری داستاں سناتے ہوئے فیض نے بتایا کہ وہ غریب گھر سے تعلق رکھتے تھے اور بھینسیں چراتے چراتے سکول میں بھی جانا شروع کر دیا اور اپنے والد کی زبانی ڈاکٹر ایوب مرزا کو بتاتے ہیں:

"مویشی کھیتوں میں گھاس سے اپنی اشتہا بجھا رہے تھے اور میں سکول میں علم کے دریا کے پہلے قطرے سے اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پیاس کو بجھانے لگا۔ الف، ب، میرے لیے ایسے تھے جیسے کسی ننگے بچے کے لیے نہایت خوب صورت پوشاک، جیسے کسی بھوکے کو لذیذ کھانا میسر ہوا ہو یا جیسے کسی اندھے کو دونوں آنکھیں مل گئی ہوں۔"(۱۷)

اسی طرح وہ گاؤں سے دوسرے گاؤں اور پھر لاہور مقیم ہوئے۔ ساتھ ساتھ وہ تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور انگریزی زبان میں مہارت بھی حاصل کر رہے تھے۔ اور وہاں سے افغانستان چلے گئے اور امیر کے دربار میں میر منشی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ محلاتی سازشوں سے بالآخر وہ محل سے راتوں رات نکلے اور ہندوستان پہنچ گئے:

"ایک تاریک شب میں انھوں نے راتوں رات دو گھوڑوں پر زینیں کسیں، بھیس بدلے اور کابل سے ہندوستان کے لیے پابہ رکاب ہوئے۔ ساری رات یہ گھوڑے دوڑاتے رہے اور اک صبح ہندوستان پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے لاہور کا رخ کیا۔۔۔ چند ہی روز میں انھیں افغانستان کا جاسوس سمجھ کر لاہور جیل خانے میں بھجوا دیا گیا۔"(۱۸)

یہ بات کہ راتوں رات انھوں نے وہاں سے فرار ہونے کے بعد ہندوستان کا رخ کیا، ظاہر ہے فیض نے خود بیان کی ہے لیکن یہ ان کے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ آئندہ سطور پر سید مظہر جمیل کے اقتباس کو بھی شامل کیا جائے گا جس میں انھوں نے فیض کے والد کے راتوں رات فرار ہونے کو خیالی بات بتایا ہے۔ ان کے مطابق اتنا طویل سفر کرنا جبکہ افغانستان میں جاسوسی کا بے حد مربوط نظام بھی تھا اور فیض کے والد ایک انتہائی اہم عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ان کی غیر حاضری فوری طور پر محسوس ہو جاتی اور اتنے طویل سفر میں ان کا بچ کے ہندوستان میں لاہور پہنچ جانا ممکن نہ ہوتا۔

غرض ان کے والد کی وفات کے بعد فیض پر قرض کا بوجھ جو فیض کے سر آیا۔ پھر زمینیں اور معاملات سے لاعلمی کی بدولت آنے والی مشکلات کا ذکر ہے۔ فیض اور ایلس کے مزاج میں فرق انھوں نے فیض کی بیٹی کی زبانی لکھا ہے:

> "ابو تو کسی کو کچھ کہتے ہی نہ تھے۔ میں نے ان کے منھ سے کبھی کرخت الفاظ نہیں سنے۔ ہر وقت ہر نوعیت کی بات سننے کو ہمہ تن گوش، ایثار اور ہمدردی کا عصا لیے ملازموں سے لے کر ہم تک سب کی مشکل کشائی کے لیے تیار۔ ممی! ویل ممی کی بات جدا ہے۔ وہ جو ہوتا ہے نا کہ کوئی بات سلیقے سے باہر نہ ہو وہ ممی تھیں اور میں۔ اگر معاملہ سلیقے سے باہر ہوا تو پھر ممی آپے سے باہر۔ میں دیکھتی کہ ہمارے گھر میں ایک عجیب Contrast ہے دونوں کو تو compare کر ہی نہیں سکتے۔"(۱۹)

فیض کی شخصیت میں بردباری اور محبت جیسی بنیادی صفات کو ان کے متعلق تقریباً سبھی لکھنے والوں نے ضرور سراہا ہے۔ دوسری طرف کہیں کہیں بچپن میں ان کو گاؤں میں ملنے والی محبتوں، اور ایک باپ کی حیثیت سے ان کی شفقت، طبیعت کے بھولپن اور قوتِ برداشت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ دراصل ان کے مزاج میں نرمی اور بردباری ایسی صفات تھیں جس نے ہمیشہ ان کے سوانح نگاروں اور مداحوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

اسی طرح جیل کے دنوں میں جو گھر میں ماحول تھا اس کی ابتدائی جھلک بھی فیض کی صاحبزادی کی زبانی دکھائی گئی ہے۔

لیکن راولپنڈی سازش کیس کی تفصیلات پر اس کتاب میں مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس طرح ان کے متعلق افواہوں سے ان کی بیٹیوں اور بیوی کا سابقہ رہتا تھا۔ اور جو سلوک ان سے روا رکھا گیا۔ فیض کے نکاح کی روداد بھی کتاب میں تفصیلاً شامل ہے اور بعد میں ان کی نرینہ اولاد نہ ہونے کا سوال جس پر فیض احمد فیض کا جواب ہے:

"یہ اولادِ نرینہ کیا ہوتی ہے ۔ اول تو اس میں ایلس کا کوئی قصور نہیں۔ عورت کے اندر نرینہ کروموسومز ہی نہیں ہوتے۔ بھئی اگر اولادِ نرینہ نہیں ہے تو قصور اپنا ہی ہے۔ لیکن یہ اولادِ نرینہ کیا ہوتی ہے۔ اصل چیز تو اولاد ہوتی ہے"(۲۰)

سوانح نگار نے ہر مکالمہ شروع کرنے سے پہلے اور کہیں کہیں درمیان میں محفل یا تنہائی کی منظر کشی ضرور کی ہے۔ پڑھتے ہوئے ذہن مکمل طور پر منظر کشی میں گم ہو جاتا ہے اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس دوران فیض احمد فیض کی کم گوئی، سگریٹ نوشی اور دیگر انداز نشست و برخاست بھی پتہ چلتے ہیں۔ اور کہیں کہیں ایسا منظر بھی پڑھنے کو ملتا ہے:

"گرمیوں کی جھلسا دینے والی فضا ملک بھر پر چھائی ہوئی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا۔ پانی جتنا پیر پیو پیاس بڑھتی جاتی تھی ٹھیکیداروں نے سڑکوں پر جو لک کا لیپ کیا تھا وہ ان کے دلوں کی سیاہی کی مانند سڑک کی رگوں میں سیاہ خون کی صورت بہہ رہا تھا۔ فضا میں ایک لرزتی ہوئی ہوائی لہر کے سوا مکمل خاموشی تھی ۔ پرند چرند سایوں کی تلاش میں غائب ہو چکے تھے۔ آوارہ کتے جن کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں ہے اپنی آوارگی کو خیر باد کہ کر پیڑوں کے سائے میں درازززبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔"(۲۱)

منظر کشی پر توجہ دینے کے ضمن میں اسی طرح ایک بار اسلام آباد میں فیض سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے پہلے اسلام آباد کے متعلق ان الطاظ میں ڈاکٹر ایوب مرزا رقم طراز ہوئے ہیں:

"کہتے ہیں یہ شہر ہے۔ ہو گا شہر۔ لیکن یہاں شور نہیں ہے۔ بغیر بازار کے اس شہر میں کبھی کھوے سے کھوا نہیں چھلتا۔ سر شام اس کے محافظ سید پور کے پہاڑوں کے سائے اس کی جانب یوں دراز ہوتے ہیں جیسے کسی

بے رحم اور بے حس حاکمِ وقت کے دست و بازو اور دیکھتے ہی دیکھتے
سرخیٔ شفق رات کی ڈسنے والی ٹھنڈی تاریکی بن کر اسلام آباد کو گھیر لیتی
ہے۔"(۲۲)

اسلام آباد نیشنل کونسل آف آرٹس کے انتظام کے دوران جو فیض کو مشکلات در پیش آئیں اور جس نظام سے ان کا سامنا ہوا اس کی ایک جھلک ان کے چیئر مین بننے اور پھر ماسکو سے واپسی پر چیئر مین شپ کے خاتمے تک دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں فیض احمد فیض کے آرٹ کی ترویج و ترقی کے لیے بنائے گئے منصوبے ناکامی کی گرد میں دبتے دکھائی دیتے ہیں۔ آرٹ پر فیض سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ادب میں فحش نگاری اور حقیقت نگاری میں فرق کے علاوہ شاعری کی اقسام میں گیت، ماہیا اور ڈھولا کے حوالے سے فیض احمد فیض کا جواب اس طرح ہے:

"ہمارے ہاں گیت لکھنے کا بہت سکوپ ہے۔ ذرا توجہ کی ضرورت ہے۔
آپ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ماہیا ایسے پڑھا جا سکتا ہے جیسے ہم اور
صوفی تبسم اپنا کلام سناتے ہیں۔ مگر چونکہ ماہیے کو آگے نہیں بڑھایا گیا
لہٰذا اس میں نئے مضامین کے ساتھ صحیح برتاؤ نہیں ہو سکا"(۲۳)

فیض احمد فیض کی اپنی پنجابی شاعری کے متعلق بھی اس میں ذکر کرتے ہوئے ایوب مرزا نے ایک نظم سننے کا ذکر کیا اور اس پر تفصیل سے بات نہیں کی۔ ایک اور بات جس کا فیض کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے وہ ہے فیض کی انسان دوستی اور اس حد تک برداشت کہ وہ کسی کی بے ادبی اور بد تمیزی کو بھی تحمل سے برداشت کر لیتے تھے۔ انھیں امراء سے زیادہ غرباء عزیز تھے اور ان کی فکر ان کے قربت وہ عملی طور پر بھی پسند کرتے تھے:

"اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب بھی آپ فیض سے امراء کا ذکر کریں تو ان
کا چہرہ بوجھل ہو جاتا ہے لیکن جونہی گفتگو میں کسی پیدل بشر یا پیدل

فرقے کا ذکر ہوا فیض ے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہو جاتے
ہیں۔ چہرے پر تازگی آجاتی ہے۔"(۲۴)

آخری باب میں فیض کی ابتدائی مشقِ سخن کے حوالے سے بات کی ہے۔ جب فیض نے ابتدا میں لکھنا شروع کیا اور کمیونسٹ مینی فیسٹو سے آشنا ہوئے جس بات کا ذکر عمومی طور پر ملتا ہے۔ اور ایم اے عربی، ایم اے انگلش کرنے کے بعد صحافت کی بات کرتے ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کو طویل انتظار کے دنوں میں بھی پر امید دکھایا ہے۔ ان کے بقول:

"میں نے پوچھا: فیض صاحب سوشلزم کی چٹھی لانے والا ڈاکیہ کہاں ہے،
کب آئے گا؟ بولے بھئی کیا کہہ رہے ہو۔ انقلاب لفافے کی صورت
نہیں آتا۔ اور یہی ہمارا المیہ ہے"(۲۵)

اس کتاب میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے جو فیض کے اٹھنے بیٹھنے کا ذکر بار بار کیا اور دورانِ گفتگو ان کے اندازِ نشست بتانے کا بھی خاص اہتمام کیا ہے۔ ہر بار گفتگو کا مقام، موسم کا حال یا کم از کم وقت کا ذکر ضرور کیا ہے۔ اس حوالے سے منو بھائی نے لکھا ہے:

"میں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ کتاب میں جہاں تک ہو سکے پینے پلانے
کے تذکرے اور حوالے غائب کر دیئے جائیں اور انہوں نے شاید اس
پر کسی حد تک عمل بھی کیا ہو گا۔ اس کے باوجود اس کتاب میں فیض احمد
فیض، ڈاکٹر ایوب مرزا کے ہر سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنا گھونٹ
حلق سے نیچے اتارتے دکھائی دیئے اور ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی ضروری
سمجھا کہ اس گھونٹ کی تمام جملہ خصوصیات بیان کی جائیں۔"(۲۶)

کتاب میں فیض کی گفتگو سے ان کی شخصیت سے متعلق کئی باتیں بآسانی سمجھ میں آتی ہیں مثلاً روپے پیسے کے معاملات میں فیض کی بے نیازی اور لالچ سے دور ہونے کے لیے ان کی آبائی زمینوں کا تصفیے سے لے کر ان کی وفات تک کئی واقعات سامنے آتے ہیں:

"اب میں نے اماں کو منوا لیا تھا کہ گاؤں جا کر زمین سب دعوے دار عزیزوں اور مزراعوں میں تقسیم کریں۔ چنانچہ میں نے گاؤں پیغام بھجوایا۔ ایک دن تحصیل دار اور پٹواری کو ساتھ لے کر گاؤں پہنچا۔ میں نے برادری کے لوگوں سے کہا کہ آبائی مکان اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہمارے لیے رہنے دو باقی سب لے لو"(۲۷)

اس پر ان کو گورنر گورمانی صاحب نے فیض احمد فیض کو زمین کی پیشکش کی جس پر فیض کے الفاظ میں اس طرح مکالمہ ہوا:

"گورمانی کہنے لگے فیض دنیا میں اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ایک غلطی کر آئے ہو ۔ بھلا کوئی اپنی زمین بھی بانٹتا ہے۔ اب دوسرا غلط کام نہ کرو۔ سرکاری زمین موجود ہے۔ میرے اختیار میں ہے لے لو۔ اس سے انکار کوئی خردمند نہیں کر سکتا۔ پاگل مت بنو۔ لیکن میری خرد ان چکروں سے آزاد ہو چکی تھی اور میں پاگل بن گیا۔"(۲۸)

۳۹۴ صفحات پر مشتمل کتاب فیض احمد فیض کے حوالے سے بہت سی معلومات لیے ہوئے ہے۔ فیض کے آباؤاجداد اور ان کی اپنی زندگی کے کئی گوشے سامنے لانے کے ساتھ فیض کے افکار و نظریات کا کافی واضح اظہار اس کتاب میں ملتا ہے۔

اگرچہ فنی طور پر اس کتاب نے سوانح نگاری کے اصولوں سے انحراف کیا ہے لیکن مکالموں کی صورت میں سوانح نگاری کا یہ روایت سے ہٹ کر تجربہ ہے۔ اس کتاب کا طرزِ بیان افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ اور آئندہ فیض شناسی کے لیے اس کتاب کے مواد کو مستند ہونے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صاحبِ سوانح سے ان کی زندگی کے دوران ہی معلومات اکٹھی کر کے شائع کرنے میں اس کتاب کے مواد کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

۳۔ ذکرِ فیض

(الف)سید مظہر جمیل، تعارف

سید مظہر جمیل ۹ مارچ ۱۹۳۶ کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن گوڑ گاؤں دلی ہے۔ انھوں نے انٹر کی تعلیم ناگپور اور حیدر آباد دکن میں حاصل کی۔ وہ ۱۹۴۹ء میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ پاکستان آئے اور ۱۹۵۰ء سے سکھر (سندھ) میں سکونت اختیار کی۔ اسلامیہ ہائی اسکول سکھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۵۳ء کی طلبہ تحریک میں پر جوش شرکت کی۔ بی اے، ایم اے (اردو) اور ایل ایل بی سندھ یونی ورسٹی حیدرآباد کیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں سکھر میں وکالت کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۳ء میں کراچی منتقل ہوئے اور یونائیٹڈ بینک میں لا آفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۹۹ء میں چیف لا آفیسر اور ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ انھوں نے ادب میں شاعری، تراجم اور تنقید و تحقیق کے شعبوں میں کام کیا۔

ممتاز شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں سے کیے گئے انٹرویوز کا مجموعہ "گفتگو" ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اردو افسانوں اور ناولوں کا تنقیدی مطالعہ "آشوبِ سندھ اور اردو فکشن" ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ سندھی تہذیب و معاشرت اور تاریخ و سیاست کا ادبی تناظر میں مبسوط اور جامع مطالعہ جدید سندھی ادب: میلانات، رجحانات، امکانات ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ۲۰۰۴ء کی بہترین نثری کتاب کا ایوارڈ دیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے ایک اہم معمار اور ممتاز ادیب سید سجاد ظہیر پر ان کی کتاب "انگارے سے پگھلا نیلم تک نئے گوشے نئے تناظر" ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ معروف سندھی ادیب اور سماجی رہنما سوبھو گیان چندانی پر ان کی تحقیق و تنقیدی کتاب سوبھو گیان چندانی شخصیت فن ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد ان کی کتاب سندھی زبان و ادب کی مختصر تاریخ" ۲۰۰۸ء میں مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ بعد ازاں سندھ کے ایک اور مشہور ادیب، سماجی رہنما اور فعال شخصیت در ابراہیم جویو کے بارے میں انکی کتاب ایک صدی کی آواز محمد ابراہیم جویو ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔

علاوہ ازیں سندھی اور انگریزی سے شاعری، افسانے اور مضامین کے اردو تراجم، اردو کے ہوائی ادب اور ایکشن پر ان کا اسمبلی کا از تکمیل ہے۔ سید مظہر جمیل کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ امتیاز عطا کیا گیا ہے اور ادارہ ثقافت حکومت سندھ کی طرف سے شیخ ایاز ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

(ب) ذکرِ فیض، تعارف و تجزیہ

ذکرِ فیض، فیض احمد فیض کی ضخیم سوانح حیات ہے۔ اس کو سید مظہر جمیل نے محکمہ ثقافت سیاحت و نوادرات، حکومت سندھ کے ایما پر مرتب کیا اور ۲۰۱۳ میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۸۳ ہے۔ اس کتاب کے ابواب کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں۔

باب ۱: پیدائش، عہد طفولیت، ابتدائی تربیت و آبائی مکان اور ماحول، بھائی، بہنیں، بچپن کا لاڈ پیار، تعلیم کے ابتدائی مراحل، اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ، چھجو رام کے لیے ہجو گوئی، لڑکپن کی چند یادیں، مرے کالج، سیالکوٹ، ابتدائی دور کے اساتذہ، کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلھا۔

باب ۲: اسلاف، والدین، خاندانی پس منظر، شجرہ نسب، والد گرامی سلطان محمد خاں، کالا قادر کا گڈریا، والد۔ تحصیل علم کا شوق، پرائمری اور مڈل کلاسوں میں اعزازی کامیابیاں، سرکاری وظیفے کا حصول، چینیوں کی مسجد، لاہور، گورنمنٹ ہائی اسکول موچی دروازہ، ھنر افغانستان امیر محمد خاں کی مسجد میں آمد اور سلطان محمد خان سے اتفاقی ملاقات، امیر محمد خان کا سلطان محمد خان کی قابلیت سے متاثر ہونا، امیر محمد خان کی ایما پر افغانستان روانی، کابل کے شاہی دربار میں، قاری اور انگریزی زبانوں میں ترجمے کی مہارت، خلوتی مراسلت اور دستاویز سازی کے کامیاب تجربہ، کابل کے دربار میں میر منشی کا عہدہ، والی افغانستان کی عنایات، امیر عبدالرحمان کی بھانجی سے شادی، ولی عہد شہزادہ حبیب اللہ کی اتالیقی - افغان امراء کی میر منشی کے خلاف محلاتی سازشوں کا آغاز و عروج و زوال کی کہانی و ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی تقریبات میں شاہ افغانستان کو شرکت کی دعوت، شہزادہ ناصر کی سرکردگی میں ایک بلند پایہ افغان وفد کی شرکت کا فیصلہ، وفد میں میر منشی کا بطور نمائندہ خصوصی شمولیت، وائسرائے ہند لارڈ کرزن کا تہنتی خط، کابل سے وفد کی روانگی، لاہور میں عارضی

قیام، لیڈی ڈاکٹر لیر ہملٹن کا ناول "Vazir's Daughter- A tale of Hazara War"، حقیقت اور افسانہ، سلطان محمد خان کا قیام لندن و کیمبرج یونی ورٹی کے کرسٹ کالج میں تعلیم کی تکمیل ، بار ایٹ لاء کی اعلی سند کا حصول، امیر عہد اور ان کی خواہش پر از امیر عبدالرحمانی" کا قاری سے انگریزی میں ترجمہ Abdul Rahman, The King of Afghanistan ، طباعت سے قبل اصل مسودے اور ترجمے کے ساتھ سلطان محمد خاں کی کابل میں طلبی، لائف آف امیر عبدالرحمان کی لندن سے اشاعت اور برطانیہ کے علمی اور حکومتی حلقوں میں کتاب کی پزیرائی ، قیام لندن کے دوران سلطان محمد خان کا دوسرا کارنامہ "افغانستان کے دستور اساسی اور قوانین" کی تالیف اور اس کتاب کی پذیرائی ، لندن سے ہندوستان روانگی، کابل سے سلطان محمد خاں کے وابستگان اور اسباب کی ہندوستان روانگی ، فیض کی والدہ سلطانہ فاطمہ (عرف بے بے جی) کی شخصیت ، فیض کے مزاج پر والد اور والدہ کے اثرات۔

باب ۳: گورنمنٹ کالج، لاہور (۱۹۲۹ء۔۱۹۳۳) ، نئی فضا، نیا ماحول بھائی کی کہانی بہن کی زبانی ، خواجہ خورشید انور کی دوستی، موسیقی کا ذوق اور انقلابیت، شاعری کا ابتدائی دور، اقبال اور فیض ، فیض کی نظم "علامہ اقبال کے حضور میں فیض کی شاعری پر پہلا نکھار، اس دور کی ادبی فضا، حسرت موہانی اور اختر شیرانی کا عہد، کالج کے اساتذہ، والد کی رحلت کا سانحہ و خاندان کا مالی بحران اور جائیدادوں کی فروخت سے قرض خواہوں کی ادائیگی، تعلیم کی تکمیل ، ایم اے (انگلش)، ایم اے (عربی)، چند مربیانِ فیض۔

باب ۴: پہلی ملازمت کا تجربہ، ایم اے او کالج کی لیکچررشپ، امرتسر کا قیام (۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۱ء)، صاحب زادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں سے ملاقات اور ذہنی ہم آہنگی، کیمونسٹ مینی فیسٹو اور سوشلزم کی کتابوں میں دلچسپی، علوم جدید کا مطالعہ، امرتسر کے محنت کشوں کے درمیان ، نئے پرنسپل دین محمد تاثیر سے تعلقات ، کیتھرین جارج کی امرتسر آمد، فیض اور ایلس کی دوستی اور ذہنی رفاقت و جدید اردو شاعری (۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۹ء)، مجوزہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی رومانی شاعری کا دورہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی میگزین، راوی اور دیگر رسائل میں کلام فیض کی اشاعت۔

باب ۵: ترقی پسند ادب کی تحریک ۱۹۳۲ء انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشور و، سجاد ظہیر کا دورہ پنجاب، پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک اور فیض احمد فیض، انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنو کانفرنس، پریم چند کا خطبہ، ہندوستانی ادب میں ایسی حقیقت نگاری کا فروغ، انجمن ترقی پسند مصنفین کی صوبائی کانفرنس - امرتسر، ترقی پسند ادب کی تحریک میں فیض کا حصہ، ادب لطیف" کی ادارت، امرتسر کی یاویں ، ایم ڈی تاثیر، سری نگر کے شری پرتاب کالج ، ایلس شملہ میں نئ ملازمت ، فیض ہیلے کالج لاہور میں بحیثیت انگریزی کے استاد تعیناتی۔

باب ۶ : امرتسر سے لاہور واپسی ، ہیلے کالج آف کامرس لاہور کی لیکچرار شپ، فیض اور ایلس - شادی خانہ آبادی، شاہی محل امرتسر میں تقریب نکاح، علامہ اقبال کا مرتب کردہ نکاح نامہ، نکاح خوانی و شادی کا مختصر منظر، ایلس بطور پنجابی دلہن ، سری نگر سے لاہور آمد، لاہور میں سواگت، دعوت ولیمہ کا اہتمام، ایلیس کو منہ دکھائی کے تحفے، لاہور کی ثقافتی سرگرمیوں میں ایلیس کی دل چسپی ، آل انڈیا ریڈیو لاہور سے ایلس کی کامیاب صداکاری، شیکسپیئر کے ڈرامے ہیملیٹ میں اوفیلیا کے کردار کی صداکاری اور ملک گیر شہرت، کینال روڈ کی رہائش کے بعض دل چسپ واقعات، شادی کے بعد لاہور کے شب و روز۔

باب ۷ : "نقش فریادی" کی اشاعت (۱۹۴۱ء) پہلے ایڈیشن میں ن م راشد کا دیباچہ، فیض کی بعض نظموں کی ملک گیر پذیرائی ، نقش فریادی کے یکے بعد دیگرے ایڈیشنوں کی اشاعت، نئ نسل میں نئ شاعری کا ذائقہ ، فیض کی نظم رقیب سے پر فراق گورکھ پوری کا یادگار اور دل چسپ تبصرہ شیکسپیئر، حافظ اور کالی داس بھی کہتے تو بھلا اس سے زیادہ کیا کہتے"، نقش فریادی کی مقبولیت۔

باب ۸ : دوسری جنگ عظیم ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹ فوجوں کی روس اور نوزائیدہ سوشلسٹ ملکوں پر ہول ناک یلغار اور اس کے اثرات، دوسری جنگ عظیم اور تحریک آزادی ہند، تحفظ ہند کی خاطر فسطائیت کے خلاف برطانوی حکومت سے تعاون کا فیصلہ ، فیض، برٹش انڈین آرمی کے شعبہ تعلقات عامہ میں ، کیپٹن فیض احمد سے کرنل فیض احمد تک، فوج میں فیض کی ذمہ داریاں، دوران ملازمت اعزازی تمغہ، فاشزم کے خلاف فیض کا موقف، فوجی ملازمت کے دوران ادبی سرگرمیاں۔

باب۹ : دلی اور روز گار دلی - سلیمہ اور منیزہ کی ولادت، دلی میں فیض اور ایلس کی ادبی و ساری مصروفیات ، جنگ کا خاتمہ میاں افتخار الدین کے اصرار پر فوج سے استعفی ، میاں افتخار الدین کا لاہور سے انگلش ڈیلی اخبار نکالنے کا فیصلہ ، پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ (PPL) کا قیام اور رجسٹریشن، دلی سے لاہور واپسی ، پاکستان ٹائمز کی چیف ایڈیٹری ، فیض کوچہ صحافت میں۔

باب۱۰: پی پی ایل کا قیام ،ڈیلی پاکستان ٹائمز لاہور کا اجراء (جنوری ۱۹۴۷ء) ہندوستان کی آزادی پاکستان کا قیام و فیض کی چیف ایڈیٹری ، وفاق پاکستان کے اساسی نکات یعنی جمہوریت، وفاقیت، فلاتی معاشرے کا قیام، عدل و انصاف کا استحکام، پاکستان ٹائمز کی انفرادیت اور مقبولیت ، فیض کے بعض مقبول اداریئے، پاکستانی حکمرانوں کے بعض غلط فیصلے اور ان کی مخالفت، ایلس کے والدین کی ہندوستان آمد و رہائش کے مسائل۔

باب۱۱ : برصغیر ہندوستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ، ہندوستان کی تقسیم، نو آزاد ریاست ہندوستان کا قیام ، نو آزاد مملکت خداداد آل پاکستان کا قیام، فرقہ وارانہ فسادات، خونی لکیر - وحشیانہ بربریت کے خون آشام مناظر، ایلس اور بچیوں کی سری نگر روانگی، صبح آزادی ۔ یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، تعمیر پاکستان کا عزم، آل انڈیا مسلم نیوز پیپرز کانفرنس میں شرکت، دہلی ،روزنامہ امروز' کا اجرا، آزادی صحافت کی تحریک، فیض کی پہلی گرفتاری اور رہائی - ہفت روزہ لیل و نہار' کا اجرا و، جمہوریت اور محنت کشوں کی تحریکیں اور فیض ،انجمن ترقی پسند مصنفین کا یوم مئی ۱۹۴۸ء، عالمی لیبر کانفرنس ۔ سان فرانسکو اور جنیوا کی لیبر کانفرنسوں میں شرکت ، پوسٹل ورکرز یونین اور فیض، جنگ برائے امن فیض کا آدرش ، انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی انتہاپسندی سے فیض کا اختلاف۔

باب۱۲ : پس دیوار زنداں (راولپنڈی سازش کیس) ، فیض کی رہائش گاہ پر مسلح پولیس کا شب خون فیض کی بغیر وارنٹ گرفتاری، باغیانہ سازش کا الزام، فیض کی قید تنہائی یا گمشدگی۔ تین ماہ تک اعصاب شکن افواہیں بدشگونیاں ، گرفتاری کے بعد خاندان پیش کی افتاد زندگی، ایلس کا آشوب حیات سے مقابلے کا فیصلہ ،لاہور کی سڑکیں اور ایلس کی سائیکلنگ ، فیض کی قید تنہائی کا آشوب ، لائل پور جیل میں ایلس اور بچوں سے پہلی

ملاقات، رہائش گاہ پر ایک اور پولیس چھاپ اور خانہ تلاشی، چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک وشام: چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت۔

باب ۱۳ : باغیوں کی اسپیشل ٹرین کا منظر، لائل پور جیل سے حیدر آباد ڈسٹرکٹ جیل منتقلی، ظفر اللہ پوشی کی منظر کشی، راول پنڈی سازش کیس (سیاق وسباق)، بعض اہم نکات: ''وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔ وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے۔

باب ۱۴ : "جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں: ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے، مقدمے میں دفاع کی تیاریاں، پسِ زنداں - بھان متی کا کنبہ جیل میں سرائے اور خانقاہ کے مکیں، قید خانے کے شب و روز ،دوران اسیری سخنوری کی یاوری ، قید تنہائی کی شاعری، جیل میں طرحی مشاعرے، زنداں میں فیض کا ذوق مطالعہ - ایام اسیری میں فیض کو صدمات مرگ، زندگی زنداں دلی کا نام ہے (ظفر اللہ پوشنی)، جیل کی زندگی کا بھرپور تاثر۔

باب ۱۵: فیض بنام ایلس - انگریزی خطوط کا اردو ترجمہ، صلیبیں مرے دریچے میں. ایلس بنام فیض - "ڈیر ہارٹ ان پریزن ٹو فیض، ایامِ اسیری کے معتبر ریکارڈ ،دوران اسیری دست صبا کی اشاعت، "کلثوم کے نام انتساب، چند ماہ میں دست صبا کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن ،کلام فیض کی عالمی مقبولیت۔

باب ۱۶: کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں، خصوصی عدالت کی کاروائی، مختلف وکیلوں سے مشاورت، دوران وکالت حسین شہید سہروردی کے کارنامے، حسین شہید سہروردی کے لیے ایک نظم، فیصلے کا دن، فیض کی سزا اپیل کا حق، حیدر آباد جیل سے بغرض علاج سینٹرل جیل کراچی منتقلی، جناح اسپتال کراچی میں قیام ، سزا کے بعد کراچی سے منٹگمری (ساہیوال) جیل منتقلی، لاہور ہائی کورٹ سے ضمانت پہ رہائی دوبارہ گرفتاری ، دوبارہ رہائی، حبس بے جا کی درخواستیں، نام نہاد سازش کیس سے مکمل بریت۔

باب ۱۷ : رہائی کے بعد پاکستان ٹائمز میں واپسی، پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل ونہار پر فوجی حکومت کا نامنصفانہ قبضہ، ہندوستان میں پاکستانی سفیر راجہ غضنفر علی کی طرف سے دلی میں یوم اقبال میں شرکت کی دعوت، ولی

میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا دعوت نامہ، طویل اسیری کے بعد پہلا غیر ملکی سفر، ہندوستان میں فیض کا فقید المثال خیر مقدم "ایسا استقبال تو بادشاہوں کا ہوتا ہے" زہر انگاہ کا تبصرہ، وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کے دور وزارت میں عوامی جمہوری چین کا فیض اور دیگر صحافیوں کا دورہ: ایک مقبول نعت بطور پاکستان کا قومی ترانہ، پاکستان واپسی، پاکستان ٹائمز سے استعفی، فلم سازی کا تجربہ، فلموں میں فیض کے گیتوں کی مقبولیت و زنداں نامہ کی اشاعت اور مقبولیت، روداد قفس از میجر محمد اسحاق (زنداں نامہ کا دیباچہ) میزان فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کی اشاعت۔

باب ۱۸ : ایفرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک اور کانفرنسیں، دلی کانفرنس میں فیض کا کردار، تاشقند ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس (۱۹۵۸ء)۔ فیض اور حفیظ جالندھری کی شرکت، عالمی سطح پر فیض کی پذیرائی، سمرقند و بخارا کی جھلکیاں ہزار سالہ جشن رودکی، دوشنبہ سے ماسکو تک، ناظم حکمت، پابلو نرودا اہرن برگ، ژاں پال سارتر سے ملاقات، مہ و سال آشنائی۔ روس کی بابت چند خوشگوار یادوں پر مشتمل کتاب۔

باب ۱۹: ماسکو سے لندن روانگی، پاکستان میں جنرل ایوب خاں کا فوری انقلاب، وطن واپسی کے لیے بے چینی، پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ملک میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں، دوسری اسیری و حکومت کی طرف سے حمایت کے لیے دوبارہ فیض کا مسلسل انکار، مدت حراست گزرنے پر رہائی، میاں افتخار الدین کی رحلت، پاکستان ٹائمز میں سرکاری ملازمت کی نئی پیش کش اور فیض کا انکار، الحمرا لاہور آرٹس کونسل کی تنظیم نو و ثقافتی سرگرمیوں کی داغ بیل، مخصوص حلقے کا فیض کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا، پہلا ہارٹ اٹیک۔

باب ۲۰: بین الاقوامی لینن پیس ایوارڈ کا اعزاز، عالمی اعزاز وصول کرنے کے لیے صدر پاکستان کا اجازت نامہ، عارضہ قلب کی وجہ سے سلیمہ ہاشمی کے ساتھ بحری جہاز سے براستہ یورپ ماسکو روانگی، لینن عالمی ایوارڈ کی تقریب میں فیض کی معرکتہ الآرا تقریر، روس میں فیض کی مقبولیت، روس سے واپسی، لندن کا عارضی قیام (۱۹۹۴ ۱۹۹۴ء)، دنیا بھر میں آباد دلدادگان فیض کے پرجوش استقبالیے، جہاں نوردی، لندن کے شب وروز، دست تہ سنگ، (چوتھا مجموعۂ کلام کی اشاعت)، سفر نامہ کیوبا- روزنامہ جنگ میں مضامین اور نظموں کی اشاعت کا سلسلہ۔

باب ۲۱ : وطن واپسی کا فیصلہ، کراچی میں سکونت، کراچی کا قیام ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۲، کراچی کی غریب بستی کھڈا میں قائم تعلیمی ادارے کی زبوں حالی، لیڈی نصرت ہارون کی درخواست پر فیض نے اسکول کا نظم و نسق سنبھالا، پہلے انٹر تک اور پھر بی۔ اے تک کالج کی منظوری ، عبداللہ ہارون کالج کی پرنسپلی، ماہی گیروں کی سوسائٹی کا قیام، کراچی آرٹس کونسل میں فیض کی سرگرمیاں، فیض اور مرزا ظفر الحسن، ادارہ یادگار غالب ،غالب لائبریری کا قیام ، پانچویں مجموعہ کلام سرِوادی سینا کی نظمیں، پاک بھارت جنگ (۱۹۶۵ء) میں فیض کی مشاورت، بیٹیوں کی خانہ آبادیاں، ڈاکٹر شوکت ہارون "شوکی خالہ"۔

باب ۲۲: ثقافتی امور میں فیض کی ول چیپی ، وزارت تعلیم میں اسٹینڈنگ کمیٹی برائے کلچر کا قیام ، فیض کی مشاورت، پاکستانی ثقافت کے خدوخال، قومی ثقافت، ایشیائیثقافت، عالمی ثقافت پر فیض کے خیالات و نیسکو کی کمیٹی برائے ثقافت میں فیض کی تقریر، فیض اور پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس، انٹرنیشنل یونی ورٹی آف ٹیکسلا کا منصوبہ۔

باب ۲۳ : سیاسی منظر نامے میں ایک اور تبدیلی ، مشرقی پاکستان کا المیہ اور فیض، عالمی جارحیت کے خلاف احتجاج، کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار: خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد، بھٹو کے وفد کے ساتھ بنگلہ دیش کا دورہ بنگلہ دیش کی خوں ریزی پر فیض کی نظمیں

باب ۲۴ : نئے پاکستان کی تعمیر، پہلی جمہوری حکومت اور فیض، مشیر برائے ثقافتی امور، لوک ورثے کی تلاش، کراچی سے اسلام آباد منتقلی ، پاکستانی ثقافت پر فیض کی بعض تحریریں ، عوامی ادبی انجمن و فیض کی پنجابی شاعری۔

باب ۲۵: روس کا ایک اور سفر ، اشک آباد کانفرنس، ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنسوں میں فیض کی شرکت، الماتے میں سجاد ظہیر کی رحلت، سجاد ظہیر کی آخری رسومات میں شرکت و جام الوداعی (نظم)، پاکستان کونسل آف آرٹس کا قضیہ ، بھٹو دور - بیوروکریسی کی کرشمہ سازیاں، ملازمت کی نئی پیشکش نامنظور، اسلام آباد سے لاہور نقل مکانی ، فیض کی سالگرہیں لانگ پلے ریکارڈز کا اجرا۔

باب ۲۶: عہد بھٹو کے آخری دو برس، حزب مخالف کی تحریکیں . ایک اور فوجی حکومت، جزل ضیا الحق کا استبدادی دور حکومت، شہری آزادیوں اور جمہوری حقوق کا خاتمہ، نام نہاد اسلام کے نام کے لوگوں پر تشدد کے مناظر، سرعام فیض کے خلاف معاندانہ رویے، پاکستان سے ترک سکونت کا فیصلہ، پہلا پڑاؤ ہندوستان، علی گڑھ یونی ورٹی کی وائس چانسلری، سرینگر میں شادی کی سالگرو، نئی افواہ سازیاں اور حقیقت احوال، ماسکو روانگی، ایفرو ایشیائی ادیبوں کے ترجمان سہ ماہی جریدہ " لوٹس"، بیروت کی چیف ایڈیٹری کی آفر - ایفرو ایشیائی ادیبوں کی چھٹی کانفرنس منعقدہ لوانڈا کے فیصلے، اس کا اداریہ فیض کی سترویں سالگرہ، یاسر عرفات کی تہنیت، ایفروایشیائی رائٹرز ایسوسی ایشن (AAWA)، اور پاکستان ایک تجویز۔

باب ۲۷ : فیض بیروت ، ابوعمار سے ملاقات کے کی جھلک، بیروت کے شب وروز ،ایلس کے مشاغل، فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلیوں کی خون آشامی، فلسطینی مہاجر بستیوں اور بیروت پہ ہولناک بم باریاں، فیض کے گھر اور دفتر کی تباہی ، فیض کا بیروت سے انخلا، کلام فیض میں فلسطینی تناظر، الادب الحزیرانی میں کلام فیض کی شمولیت، عرب ریڈیو سے فیض کی نظموں کے عربی تراجم کی نشریات۔

باب۲۸ : جہان نوروی، دنیا بھر میں دل دادگان فیض کے استقبالیے، ہم مسافر یونہی مصروف سفر جائیں گے، لندن اور فیض، فیض کے مغربی حوالے، روس کی یاترائیں، روس میں غیر معمولی مقبولیت، ہندوستان، دلی، بمبئی ، لکھنو، بنگلور، بھوپال، ہریانہ میں فیض کی تقریبات، ہندوستان میں یوم اقبال تقریبات میں فیض کے لیکچرز، یورپ میں لندن، ایڈنبرا، مانچسٹر، آکسفورڈ، پیرس، رومانیہ، جرمنی، اٹلی، سویڈن وغیرہ میں پذیرائی ، فیض اکیڈی (انٹرنیشنل) لندن کا قیام۔

باب۲۹ : شام شہریاراں(۸ے۱۹ء)، مرے دل مرے مسافر(۱۹۸۰)، غبار ایام (۱۹۸۲ء) کی اشاعتیں- ایفرو ایشیائی اویوں کی تحریک میں فیض کا حصہ، خود ساختہ جلاوطنی کے پانچ برس، امریکا، کینیڈا، افریکا اور ایشیائی ممالک کے متعدد دورے فیض کی بے مثال جہاں نوردی، عالمی مقبولیت ، وطن واپسی کا فیصلہ، خود ساختہ جلاوطنی کی وضاحت، فیض۔ ضیاء ملاقات، بیروت سے انخلا کے بعد اس کے نئے دفتر کی تلاش، لندن سے

کلیات فیض "سارے سخن ہمارے" کی اشاعت، پاکستان سے کلیات فیض نسخہ ہائے وفا کی اشاعت، سارے سخن ہمارے کی انفرادیت۔

باب ۳۰ : مترجم فیض۔رسول حمزہ توف کی نظمیں ،ناظم حکمت کی نظمیں، اولجز عمر علی سلیمانوف کی نظموں کے ترجمے، پیام مشرق کا انتخاب اور ترجمہ، چند اقتباس۔

باب ۳۱ : فیض کی انگریزی نظمیں۔ فیض کی نظم Ilusion اردو ترجمہ خواب پریشاں از پروفیسر ایم کی مطبوعہ ماہنامہ افکار کراچی فیض نمبر ۱۹۶۵ء، یونی کورن اینڈ ڈانسنگ گرل، مطبوعہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۳مارچ ۱۹۹۳ء، موہنجو دڑو سے بر آمد ہونے والے دو اساطیری کردار، عظمت انسان کا رزم نامہ، نظم کا انگلش متن اور آزاد ترجمہ۔

باب ۳۲ : کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی، لوٹس کے اردو ایڈیشن کی تجویز فیض کی زندگی کے آخری دو برس، ماسکو کا آخری سفر، لندن یونی ورسٹی میں عالمی فیض سیمینار، گزرے دنوں کی یادیں، کالا قادر کا آخری پھیرا، ضیق النفس کا جان لیوا دور، فیض کی رحلت، آخری سفر، دنیا بھر کے دلدادگانِ فیض کی سوگواریت، پہلا تعزیتی اجلاس ٹورنٹو کینیڈا، لاہور پہلا تعزیتی اجلاس، فیض گھر۔جشنِ فیض کی تقریبات

باب ۳۳: عالمی ادب میں کلام فیض کے تراجم

اس سوانح عمری میں فیض کی زندگی کے احوال پیدائش سے وفات تک ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ اور آخری باب میں فیض کے عالمی سطح پر تراجم اور ان کی پذیرائی کے احوال شامل کیے گئے ہیں۔ سید مظہر جمیل کے مطابق اس سوانح عمری کا نام "ذکرِ فیض" ان کی زندگی میں ہی طے ہو چکا تھا۔ کتاب کے آخر میں حواشی، کتب کی فہرست اور اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مندرجات کے حوالے اور ان کے ساتھ سوانح نگار کی رائے بھی شامل ہے۔ اسی سوانح میں ابتدا میں سوانح نگار نے دیگر فیض کی سوانحی تحریروں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق آرا بھی پیش کی ہیں۔ کتاب میں کہیں کہیں تفصیلات کی بہتات، طوالت اور بعض واقعات کی ایک سے زیادہ بار بازگشت بھی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ سوانح نگار نے فیض سے متعلق

ہر ادارے اور ملکی و غیر ملکی حالات اور دیگر کی تفاصیل بھی پیش کی ہیں۔ فیض کی جائے پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"فیض کے بعض سوانح نگاروں نے سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے ایک گاؤں کالا قادر کو فیض کا مولد قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے"(۲۹)

اس ضمن میں سوانح نگار نے فیض کے ایک انٹرویو جو انھوں نے پروفیسر رالف رسل اور عبادت بریلوی کو دیا اس کا ذکر بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ فیض نے خود اپنا مولد سیالکوٹ بتایا ہے۔ دیگر سوانح نگاروں نے جو کالا قادر کو فیض کا مولد قرار دیا وہ درست نہیں۔ فیض کے والد کی شخصیت کے متعلق اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق تفصیلی گفتگو کے بعد سوانح نگار نے فیض کے والد کی قلعہ لاہور میں قید کی بات کر بے بنیاد قرار دیا ہے:

"یہاں شک و شبے کی بنا پر گرفتار کیے جانے اور قلعہ لاہور میں قید کیے جانے کی جو داستان سلطان محمد خاں کے بارے میں مشہور ہوئی وہ محض قیاسی، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ نیز یہ کہانی اس وقت کے سیاسی و سماجی حقائق سے چشم پوشی کے مترادف بھی ہے۔(۳۰)

ان کے مطابق اس وقت اس قدر مربوط جاسوسی کا نظام تھا، اس طرح افغانستان سے نکلنا اور اتنا طویل سفر سلامتی کے ساتھ مکمل کر لینا خارج از امکان تھا۔ اور افغانستان سے لاہور تک جابجا افغان اور انگریز پہرے تھے ان سے بچ کر نکلنا ناممکنات میں تھا وہ بھی جبکہ اس قدر سامان اور لاؤ لشکر کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے تو بعید از قیاس بات معلوم ہوتی ہے:

"یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سلطان محمد خاں کے راتوں رات فرار کا قصہ ایسے لگتا ہے جیسے ڈاکٹر للیز ہملٹن کے دل چسپ ناول A Vazir's Daughter___ A Tale of the Hazara War سے ماخوذ ہو۔ لگتا ہے کہ مذکورہ ناول کے آخری دو ابواب میں

بالخصوص بیان کردہ سنسنی خیز واقعات کو سلطان محمد خاں کے فرار پر
منطبق کر دیا گیا ہے۔"(۳۱)

عام تاثر جو للیز ہملٹن کے مذکورہ ناول سے لیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ ناول فیض کے والد کی کہانی ہے حالانکہ وہ ہو بہو ان کی سوانح کی بجائے ان کی زندگی کے بعض واقعات سے مماثل ہے جس کا ذکر ناول پر سلطان محمد خاں کے اپنے تبصرے میں بھی شامل ہے۔ فیض کے والد کے افغانستان میں قیام، افغانستان سے ہندوستان واپسی اور پھر لندن کے قیام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں ان کی وضاحت کرتے ہوئے سید مظہر جمیل آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ برطانیہ میں سلطان محمد خان کا قیام کسی مفرور اور مشکوک شخص کی بجائے ایک معزز اور مراعات یافتہ فرد کی حیثیت سے رہا اور انھوں نے وہاں جا کر سب سے پہلے اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل پر توجہ دی اور مغربی علوم، تہذیب و تمدن، سیاسیات، و اخلاق اور عدل و انصاف کے مروجہ ضابطوں اور قوانین کا گہرا مطالعہ کیا۔"(۳۲)

فیض کے بہن بھائیوں اور ان کے بچپن، ابتدائی تعلیم کے حالات اور ان کی شخصیت پر ان کے والدین کے اثر کا ذکر کرنے کے بعد مظہر جمیل نے اس سوانح میں فیض کے مجوزہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی "جدید اردو شاعری ۱۹۳۹-۱۸۵۷" کا خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے جس کو پنجاب یونی ورسٹی سے حاصل سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شائع بھی کیا۔ تاہم اس خاکے کے متعلق فیض احمد فیض کی طرف سے یا یونی ورسٹی کی طرف سے کسی پیش رفت کے آثار نہیں ملتے۔

"قرین قیاس یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ فیض نے پی ایچ ڈی کرنے کی تجویز ہی سے ہاتھ اٹھالیا ہو۔ اس ضمن میں مزے کی بات یہ ہے کہ فیض کی مذکورہ درخواست اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام کا مجوزہ خاکہ کار

پردازان یونی ورسٹی نے ردی کے اس ڈھیر میں شامل کر دیا تھا جسے
یونیورسٹی رواج کے مطابق وقتاً فوقتاً تلف کر دیا جاتا ہے"(۳۳)

فیض کا امرت سر میں قیام اور محمود الظفر اور بیگم رشید جہاں سے ملاقات اور ان کا فیض پر اثر، فیض کے ان دنوں کا احوال ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا اور ڈاکٹر ایوب مرزا کے بیانات سے بہت مماثل ہے۔ سید مظہر جمیل نے بھی یہی لکھا ہے کہ فیض نے امر تسر کے قیام کے دوران کیمونسٹ مینی فیسٹو کو پڑھنے کے بعد سوشلزم سے فکری تعلق قائم کیا اور ان کی آئندہ زندگی پر اس دور کا بہت اثر رہا۔ وہاں کے شب و روش کے حالات، مصروفیات، فیض کی گرفتاری، اس وقت کی افواہیں اور راولپنڈی سازش کیس پر سیر حاصل گفتگو ہے اور اس کی تمام تر تفصیلات کو قلمبند کیا گیا ہے:

"راولپنڈی سازش کیس کے بابت تحقیقی مواد بہت کم سامنے آیا ہے۔
جس کی وجہ تھی کہ خصوصی قانون کے ذریعہ مقدمے کی تمام تر
کارروائی کو خفیہ قرار دے دیا گیا تھا۔ یہاں کہ تک ملزمین کو مقدمے
کے دوران جو کاغذات دیے گئے، وہ بھی مقدمہ ختم ہونے کے بعد ان
واپس لے لیے جاتے تھے۔ انھیں اپنے بیانات کی کاپیاں تک رکھنے کی
اجازت نہیں۔ مقدمے فیصلہ کا بھی صرف پڑھنے کے لیے فراہم کیا گیا
تھا۔"(۳۴)

اس دوران یہی نہیں کہ فیض اور ان کے ساتھ ملزمان کو کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی بلکہ خط و کتابت بھی ممنوع تھی۔ بعد ازاں جب خط لکھنے کی اجازت ملی تو بھی خطوط سنسر کیے جاتے تھے اور جیلر کی مہر کے ساتھ خطوط کی ترسیل کی جاتی تھی۔ اس طرح کچھ کھل کر لکھنے لکھانے کا بھی مسئلہ تھا۔ جبکہ کاروائی کا حد درجہ خفیہ قرار پانا بھی ایسی وجہ ہے کہ راولپنڈی سازش کیس کی تفصیلات کم ملتی ہیں:

"اس صورت حال میں بہت کم مصدقہ اطلاعات جو تھیں تاریخ میں
محفوظ ہو سکیں۔ بعد میں کورٹ کا جو ریکارڈ میجر جنرل اکبر خان کی پر

درخواست declassified کیا گیا اور جسے انھوں نے اپنی خود نوشت
سوانح عمری Kashmir in Raiders میں شامل کیا، اس میں صرف
استغاثہ کے گواہوں کے بیانات ہیں، صفائی کی جرح یا ملزمین بیانات یا
میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح حسن ظہیر کی کتاب "راول پنڈی سازش
کیس" بھی میں جو اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس کراچی سے شائع ہوئی تھی،
ای ڈی کلاسیفائڈ مواد پر اکتفا کیا گیا ہے۔ (۳۵)

فیض نے اپنے انٹرویوز میں یہ بات اسی طرح بتائی ہے کہ راول پنڈی سازش کیس دراصل ملکی حالات کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز ہو رہی تھیں۔ اس میں فیض احمد فیض بھی شریک ہوئے۔ باقی افراد نے کئی تجاویز پیش کی تھیں۔ جس میں حکومت کو نااہل سمجھ کر بغاوت کی تجویز بھی آئی جس کو مسترد کر دیا گیا:

"اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حکومت ہمارے فوجی دوستوں سے خفا تھی
اور شاید حکومت کا تاثر بھی یہ تھا کہ وہ لوگ پوری طرح حکومت کے
فرماں بردار نہیں ہیں اور وہ ان سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ اس طرح انھیں
ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ ہم تو یونہی بیچ میں پھنس گئے تھے۔" (۳۶)

فیض احمد فیض کی اس بات سے ڈاکٹر لدمیلا نے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ ان کے خیال میں فیض بذات خود بھی حکومت کے لیے بہت خطرے کی علامت تھے اور انھوں نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے۔:

"لیکن ساتھ ہی ساتھ شاعر کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ
نافرمان فوجی افسران ہی حکام کا اصل نشانہ تھے۔ غیر قانونی پاکستانی
کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری سجاد ظہیر اور حکومت کی مخالف بائیں
بازو کی طاقتوں کی علامت فیض بذاتِ خود حکومت کی نظر میں کچھ کم
مخالفین نہین تھے۔ ان اخبارات کے کارکنوں کی گرفتاری جن کے مدیر

اعلیٰ فیض تھے، اس کا واضح ثبوت ہے۔ افسرانِ فوج کے درمیان فیض کی
اتفاقی موجودگی حکام کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی"(۳۷)

اسیری کے دوران فیض اور ایلس کی خط و کتابت کے مجموعے "صلیبیں مرے دریچے میں" کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایلس کے خطوط کا انگریزی مجموعہ "Dear Heart__ Faiz" کے چند اقتباسات بھی شامل کیے ہیں اور اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"ڈیر ہارٹ میں خطوط انگریزی زبان ہی میں لکھے گئے تھے اور ان کی
اشاعت کم و بیش تیس پینتیس برس گزرنے کے بعد ہی ممکن ہوئی۔ ان
خطوط کا اب تک ترجمہ نہیں ہو سکا۔"(۳۸)

سید مظہر جمیل نے فیض کے پنجابی کلام کا جائزہ بھی لیا ہے، ان کے تراجم، انگریزی نظموں پر بھی سیر حاصل تبصرے کیے ہیں۔ صرف ایک جگہ ان کے بیان میں تضاد ملتا ہے کہ وہ مشہور نظم "ویبقیٰ وجہ ربک" کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ نظم سراپا جوش اور یقین و ایمان کی بے پناہ قوت کی حامل نظم ہے۔ بے
شک نظم عرب اسرائیل جنگ کے تناظر میں لکھی گئی۔ اگر فلسطینی عوام کی
جدوجہد، وطن کی اٹوٹ چاہ اور ایثار و قربانی کے عملی مظاہر فیض کی عملی
زندگی میں شامل نہ ہوتے تو شاید اتنی بھرپور اور پر تاثیر نظم نہ لکھی جا
سکتی۔"(۳۹)

اور اسی کتاب کے صفحہ ۹۷۰ پر اسی نظم کے متعلق درج ہے:

"یوں تو یہ قوالی فیض نے انقلابِ ایران کے پس منظر میں لکھی تھی لیکن
اس میں دنیا بھر کے جہد و عمل کی پیکار میں گرفتار اور ظلم و استبداد کے
خلاف جہاد کرنے والوں کے عزم و حوصلے کا ایسا پرجوش اظہار ہوا ہے

کہ حق و باطل کی جنگ میں اس کو حق پرستوں کے رزم نامے کا مقام مل گیا ہے"(۴۰)

جس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ نظم عرب اسرائیل جنگ کے تناظر میں لکھی گئی تھی یا پھر اس کا تعلق ایران کے انقلاب سے تھا۔ اسیری سے رہائی کے بعد فیض نے جب "پاکستان ٹائمز" میں دوبارہ کام شروع کیا تو ان کو پہلے جیسا توانا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اب وہ اس ادارے میں مزید کام نہیں کر سکتے۔ اس ادارے کی پہلی جیسی جرات مندی کا مظاہرہ مفقود تھا۔ فیض جس سوچ سے وہاں آئے انھیں جلد ہی محسوس ہوا کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے:

"انھیں شروع ہی سے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے اپنے ادارے کے طور طریقے بہت حد تک بدل چکے تھے۔ وہ اب بھی پرگریسیو پیپرز لمیٹڈ کے ااخبارات کے چیف ایڈیٹر تھے لیکن جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ فیض کو قدم قدم پر مغائرت کا احساس ہونے لگا تھا۔"(۴۱)

اس طرح فیض کو مالی پریشانی کا سامنا تو زندگی کے بڑے حصے میں لازمی کرنا پڑا چاہے وہ قید کے دوران ہو یا اصولوں پر سمجھوتا نہ کرنے پر۔ دوسری طرف ان کے متعلق یہ بات کوئی مبالغہ نہیں رکھتی کہ فیض کی طبیعت میں مال دولت کی خواہش اور کسی جاہ و منصب کی تمنا کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ضرورت تو کسی بھی انسان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ فیض کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایلس نے بہت مشکل حالات میں اپنے گھر کے انتظامات کو سنبھالا تھا۔ اسی زمانے میں سید مظہر جمیل نے فیض کی فلم سازی میں طالع آزمائی کے حوالے سے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ جس میں فیض کے فلمی نغموں اور فلم سکرپٹ کی کامیابی یا ناکامی کا احوال بھی پیش کیا گیا ہے۔ فیض نے جو فلم "جاگو ہوا سویرا" لکھی اور اس کی پذیرائی امید سے کہیں کم ہوئی تو فیض نے فلم نگری سے تعلق کم کر لیا:

"فیض اس بات سے بہت دل برداشتہ تھے کہ اتنی اچھی فلم کو عوامی سطح پر مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ "جاگو ہوا سویرا" کی ناکامی نے فیض کو خاصا مایوس کیا تھا اس لیے وہ اس شعبے سے مستقل وابستگی قائم نہ رکھ سکے۔"(۴۲)

حالانکہ اس ڈرامے کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا اور ایوارڈ کے لیے نامزد بھی کیا گیا۔ لیکن فیض کی خواہش تھی کہ عوام اس پیغام سے آشنا ہو سکیں جو کہ اس وقت نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ایک ڈرامے "Blood Wedding" پر فلم بنانے کے لیے فیض نے مکالمے وغیرہ بھی لکھے جن کو کوئی فنانسر دستیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ڈاکومینٹری فلم میں سوانح نگار کے مطابق کم و بیش نو فلمیں موجود ہیں۔ جن میں اقبال کی سیرت " روزگارِ فقیر " پر ڈاکومینٹری اور ایک نہایت اہم منظوم سکرین پلے "The Unicorn and the Dancing Girl" جس کے متعلق سید مظہر جمیل لکھتے ہیں:

" یہ نظم فیض کی شاعری میں سب سے الگ اور اہم مقام کی حامل ہے لیکن بد قسمتی سے نہ تو اب تک اس نظم کا اردو ترجمہ کیا جا سکا اور نہ اردو شاعری کے ناقدوں نے اس طرف خاطر خواہ توجہ دی ہے۔"(۴۳)

ڈاکٹر لدمیلا نے بھی اس نظم کے حوالے سے لکھا ہے جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا متن سید مظہر جمیل نے اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ سوانح نگار نے فیض کی زندگی میں فلم سازی کا سب سے تلخ تجربہ فلم "دور ہے سکھ کا گاؤں" کو قرار دیا ہے۔ پھر الحمرا آرٹس کونسل میں فیض نے بہت دل لگا کر کام کیا لیکن وہاں بھی ان کو خاطر خواہ ماحول میسر نہ آ سکا اور فیض مستعفی ہو گئے۔ ان کے پاس منصوبہ بھی تھا صلاحیت بھی مگر سیاسی امور راہ میں حائل ہو گئے تھے اور فیض نے بد دل ہو کر کنارہ کشی میں عافیت سمجھی۔ اس کے علاوہ فیض کا انٹرنیشنل یونی ورسٹی اور ٹیکسلا کا منصوبہ بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ایک چیز جو ان معاملات سے فیض کی شخصیت کے بارے میں سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ فیض نے جس کام کو بھی شروع کیا دل و جان سے اس کو درجہ کمال تک پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن عملی طور پر شاعری کے علاوہ ان کو دیگر کاموں میں بہت زیادہ رکاوٹوں کا سامنا رہا۔ انھیں دنیا میں تو باعزت مقام حاصل تھا مگر اپنے وطن میں معاملہ دگرگوں تھا۔

ایسی ایک مثال اقبال کے صد سالہ جشن کے اجلاس میں پروفیسر جگن ناتھ کی زبانی سید مظہر جمیل نے لکھی ہے:

> "فیض صاحب نے کاؤنٹر پر بیٹھے صاحب سے کہا "لائیے ہمارا بریف کیس اور پروگرام وغیرہ" انھوں نے پوچھا، آپ کا نام؟ انھوں نے کہا "فیض"، تو کاؤنٹر والے صاحب نے دوبارہ کہا کہ پورا نام بتائیے، اب معلوم نہیں فیض صاحب پر کیا گزری ہوگی، میں تو سناٹے میں آ گیا۔"(۴۴)

فیض نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا۔ بیروت میں جہاں انھوں نے بلند حوصلے کا مظاہرہ کیا وہاں فلسطین کے آشوب کو اپنی شاعری میں سمو لیا۔ مظہر جمیل نے فیض کی تمام تحریروں میں سے متعدد نظم، غزل، دیباچے، مضامین، اداریے، خطوط، سکرپٹ وغیرہ کو سوانح میں شامل کیا ہے۔ دوسری طرف فیض کی شخصیت اور فن پر لکھے اور پڑھے گئے تقریباً تمام متون پر کسی نہ کسی حوالے سے بات بھی کی ہے۔ انھوں نے فیض کی سوانح نگار ڈاکٹر لدمیلا کے مطابق لکھا ہے کہ لدمیلا نے مخصوص سوچ کے تحت فیض کی نظموں کی تشریح و تعبیر کی ہے:

> "اسی خاص رویہ کی روشنی میں انھوں نے فیض کے آخری دور کی نظموں کی تعبیریں کی ہیں۔ جس کے مطابق فیض کو سوشلسٹ روس کی انہدام کا احساس ہو گیا تھا اور ان کے لہجے میں حزنیہ کیفیت غالب آنے لگی تھی۔"(۴۵)

سید مظہر جمیل کے خیال میں یہ تھکان صرف عمر کے ساتھ ساتھ جسمانی قویٰ کی کمزوری کے سبب سے تھی اور فیض کے دل و جذبات کی توانائی بہم موجود تھی۔ صرف فیض بڑھتی عمر اور بیماری کے باعث اب جلدی تھک جاتے تھے ورنہ سید مظہر جمیل کے بقول آخری وقت تک وہ محفلوں اور مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے:

"دوپہر دو تین گھنٹے آرام کا وقت بہر حال نکالنا ہوتا تھا۔ فیض خوش خوش لوگوں کا استقبال کرتے خوب گپ شپ رہتی تھی لیکن ماحول میں وہ پہلی سی بے ساختگی نہیں تھی ، فیض پر تکان کے اثرات نمایاں تھے سگریٹ نوشی ترک کرنے کے بعد سے جیسے وہ گم سے رہنے لگے تھے۔"(۴۶)

آخری دو ابواب میں تعزیتی اجلاسوں اور فیض کے کلام کے عالمی زبانوں میں ترجمہ نگاروں اور تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ انگریزی تراجم میں وکٹر جی کیرنن، نیومی لیز رڈ، داؤد کمال، شعیب ہاشمی اور ڈاکٹر بیدار بخت کے تراجم پر الگ الگ بحث کی ہے۔ اس کے بعد روسی، فرانسیسی، جرمن، نارویجن، سویڈش، ڈچ اور چیک میں بھی فیض کے تراجم کے متعلق معلومات اکٹھی کی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد فیض کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کسی پہلو پر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

اشتراکات:

تینوں سوانح عمریوں میں فیض کے سوانحی کوائف میں فیض کا نام، تاریخ پیدائش اور فیض کے والد کے متعلق ایک ہی حوالہ پیش کیا ہے جو فیض نے ماہنامہ "افکار" کے فیض نمبر کی اشاعت کے موقع پر ۱۶ اپریل ۱۹۶۵ کو صہبا لکھنوی کے نام خط میں تحریر کیا۔

فیض کی طبیعت میں کم گوئی، درگزر اور برداشت کی صلاحیت کا ذکر بارہا آیا ہے، ان کی نرم خوئی اور بردباری میں ان کے گھر کے حالات اور والدین کی تربیت کے اثر کی جھلک نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال سے ملاقات، ان کی موجودگی میں تلاوت اور نظم خوانی کے علاوہ فیض کے اقبال کے لیے کلمات تینوں سوانح عمریوں میں شامل ہیں۔

شاعری کی ابتداء کے متعلق چھجو رام کے لیے ہجو گوئی اور مولوی میر حسن کی شاگردی میں اولین کوششِ سخن کا ذکر کیا ہے۔

فیض کی اسیر ی کے ایام کے متعلق اور اس دوران گھر والوں تک پہنچنے والی افواہوں میں تفصیل کی کمی بیشی کے ساتھ ایک ہی جیسے حالات درج ہیں۔

نقشِ فریادی کی اشاعت اور اس کتاب کی پذیر ائی کا احوال بھی تینوں سوانح عمریوں میں درج ہے۔

بیٹیوں کے رشتے کے متعلق مشرقی باپ کا روایتی کر دار سامنے آتا ہے۔ اور دونوں بیٹیوں کی شادی پر بالکل ایک جیسی تفاصیل درج ہیں۔

فیض کے مذہب سے متعلق واقعہ کہ میر امذہب وہی ہے جو مولانا روم کا تھا۔ تینوں کتابوں میں اسی طرح تحریر کر دہ ہے۔

ثقافت کے متعلق خیالات اور کلچر کے حوالے سے کام کرنے کی لگن ، اس حوالے سے شبانہ روز محنت کے واقعات تینوں کتب میں آئے ہیں۔

ملازمت، سوشلزم سے دلچسپی اور اس کے متعلق فیض کے خیالات میں، فیض کی ملک میں اور بیرونِ ملک صحافتی زندگی اور بین الاقوامی اسفار کی زمانی ترتیب اور تعداد میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔

صاحبزادہ محمود الظفر، بیگم رشید جہاں سے ملاقات، اشتراکیت سے آشنائی، ترقی پسند تحریک کے حالات۔

تینوں سوانح نگاروں نے فیض کی شخصیت میں بنیادی طور پر انسان دوستی ، نرم دلی، محبت ، در گزر اور حوصلہ مندی کی نشاندہی کی ہے۔ عادات میں کم گوئی اور خندہ پیشانی کو سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بر تا ہے۔

مزدوروں کے حقوق کے لیے کوششوں، ان کے لیے ہمدردی، آرٹس کونسل، کلچر میں دلچسپی، سقوط ڈھاکہ کا اثر، حکومت سے تعلقات کی تفاصیل بھی یکساں ہیں۔

فیض کی تمام کتب کی اشاعت اور ان سے متعلق تقریبات کا احوال بھی تینوں سوانح عمریوں میں موجود ہے۔

بین الاقوامی سطح پر فیض کی پذیرائی اور عالمی ادیبوں سے ملاقاتوں کا احوال بھی تینوں کتب میں تقریباً یکساں موجود ہے۔

تینوں سوانح نگاروں نے اس ترجمے کا ذکر نہیں کیا جو انھوں نے "The Benefactor" کے عنوان سے شائع کروایا اور یہ سیرت پر فقیر وحید الدین کی کتاب "محسنِ اعظم" کا ترجمہ ہے۔ اس کا ذکر پروفیسر سحر انصاری نے کیا ہے:

> "ان دنوں فیض صاحب فقیر وحید الدین کی کتاب "محسنِ اعظم" کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ اس کتاب کا تعلق رسولِ پاکؐ کی سیرت سے ہے۔ فیض کا ترجمہ 'TheBenefactor' کے نام سے شائع ہوا۔"(۴۷)

افتراقات:

پرورشِ لوح و قلم روسی زبان سے اردو میں ترجمہ شدہ ہے جبکہ ہم کہ ٹھہرے اجنبی اور ذکرِ فیض اردو زبان میں تحریر کردہ سوانح عمریاں ہیں۔

ضخامت کے اعتبار سے ذکرِ فیض کو ۱۰۸۳ صفحات ۳۳۳ ابواب کے ساتھ اولیت حاصل ہے دوسرے نمبر پر پرورشِ لوح و قلم ہے جس میں ۲۹۶ صفحات اور ۱۴ ابواب شامل ہیں؛ اور پھر "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" ہے جس میں ۳۲ بلا عنوان مختصر ابواب ہیں۔

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کی کتاب روس سے فیض کی وفات کے کئی برس بعد شائع ہوئی، ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریر کردہ کتاب فیض کی زندگی میں لاہور سے اور ذکرِ فیض، فیض کی وفات کے پینتیس برس بعد کراچی سے شائع ہوئی۔

ذکرِ فیض میں زمانی اعتبار سے واقعات کی ترتیب پیش کی گئی ہے اور آخری ابواب میں فیض کے شاعری کے علاوہ حوالے اور ان کی پذیرائی کو شامل کیا گیا ہے۔ پرورش لوح و قلم میں ایک طرف زمانی ترتیب بھی ہے ساتھ ہی کتاب کے اختتام کے ساتھ فیض کی فکری جولانی کو بھی مدھم ہوتے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم کہ

ٹھہرے اجنبی میں زمانی ترتیب کہیں نہیں ہے بلکہ جس طرح قسط در قسط سوال و جواب کی نشست کی صورت میں سوانحی واقعات و معلومات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پرورشِ لوح و قلم میں ہر باب کو ایک عنوان دیا گیا ہے اور اس کی مناسبت سے فیض کا ایک شعر بھی درج کیا گیا ہے جو اس باب کے مشمولات کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی میں بلا عنوان سوال یا منظر سے ہر باب کا آغاز ہے جبکہ ذکرِ فیض میں عنوان کی جگہ باب کا نمبر درج ہے اور باب کے آغاز سے عنوانات اور ذیلی عنوانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کہ ایک خاص دور یا پہلو کے متعلق کافی معلومات مہیا کرتا ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی میں فیض کے سوانحی حالات کی بجائے ان کی فکر اور رائے کو جمع کیا گیا ہے۔ پرورشِ لوح و قلم میں سوانحی حالات کے لیے مختلف ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے اور ہر باب کے آخر میں اس کے حوالہ جات کو درج کیا گیا ہے۔ اسی طرح ذکرِ فیض میں بھی مستند ذرائع سے حوالے شامل ہیں لیکن اس میں تمام مآخذ کی فہرست کتاب کے آخر میں درج کی گئی ہے۔

فیض کی جائے پیدائش ڈاکٹر لدمیلا نے کالا قادر بتائی ہے، ڈاکٹر ایوب مرزا نے صرف سیالکوٹ میں پرورش جبکہ سید مظہر جمیل نے اس کو باقاعدہ واضح کیا ہے کہ فیض کی جائے پیدائش سیالکوٹ ہے اور کالا قادر کو فیض کا مولد قرار دینا درست نہیں۔

ڈاکٹر لدمیلا اور ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کے بہن بھائیوں کی تعداد کو واضح طور پر نہیں بتایا، "ذکرِ فیض" میں فیض کے دس بہن بھائیوں کا ذکر ملتا ہے۔

لدمیلا نے فیض کے والد کی کابل سے روانگی کو ناموافق حالات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جبکہ مظہر جمیل کے مطابق وہ افغانستان کے امیر کے حکم کے مطابق روانہ ہوئے تھے۔

ڈاکٹر لدمیلا کے اس بیان کو کہ فیض چہل قدمی کرتے ہوئے نکلے اور باہر چل گئے، مظہر جمیل نے مسترد کیا ہے کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں راولپنڈی سازش کیس کی تفصیلات شامل نہیں کیں اور اسیر ی کے دوران فیض کے اہل خانہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا نے ایک باب مکمل سازش کیس کے موضوع پر اور سید مظہر جمیل نے اپنی کتاب کے باب نمبر ۱۴، ۱۳، ۱۲ اور ۱۶ میں مکمل طور پر راولپنڈی سازش کیس کے موضوع کا احاطہ کیا ہے جبکہ باب ۱۵ میں اسیر ی کے حوالے سے اور خطوط کا تذکرہ کیا ہے۔
ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے فیض کی نظم "Unicorn and the dancing girl" کے کچھ حصے کی شرح کی ہے جبکہ سید مظہر جمیل نے اس نظم کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس نظم کا ذکر نہیں کیا۔
صرف "ذکرِ فیض" میں فیض کے پی ایچ ڈی کے لیے مجوزہ مقالے کا خاکہ موجود ہے۔
"ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کے علاوہ دونوں کتب میں فلم "جاگو ہوا سویرا" کے سکرپٹ اور اس کی پذیر ائی کا ذکر موجود ہے۔ ذکرِ فیض میں اور بھی فلموں میں فیض کے کام کی تفصیلات موجود ہیں۔

تعینِ قدر:

تینوں سوانح عمریوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کی زندگی میں "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" شائع کی جس کو فیض نے خود بھی دیکھا، اس لیے فیض کے متعلق کسی بھی حوالے سے اس کتاب سے رجوع کرنا فیض کی شخصیت اور خصوصاً ان کے نظریات کو سمجھنے کے لیے قابلِ قدر مواد فراہم کرنے کا ذریعہ رہے گا۔ سوانح نگار اس کتاب کو پڑھنے کے دوران بہت زیادہ نظریات پر گفتگو اور صاحب سوانح کی نشست وبرخاست اور منظر نگاری سے بات میں تاثر بڑھانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلوبِ بیان کے حوالے سے اس کتاب میں سوانح نگاری کے اصولوں سے ہٹ کر نئی طرز اختیار کی گئی ہے جو روایتی سوانح نگاری کے فن پر تو پوری طرح نہیں اترتی لیکن ایک نئے تجربے کے طور پر ضرور قابلِ توجہ ہے۔

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے جہاں ایک غیر ملکی سوانح نگار کی حیثیت سے جس طرح فیض کو پیش کیا اس طرح نہ صرف اردو اور پاکستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اور روسی زبان میں بھی فیض کی پذیرائی ان کے مقام اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا نے اردو زبان و ادب کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس

سوانح کو پیش کیا ہے اور یہ بھی تاثر ملتا ہے کہ اردو کا دائرہ کس حد تک وسیع ہو سکتا ہے نیز اردو زبان عالمی سطح پر بھی بہت مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس سوانح میں فیض کا حوالہ اردو زبان کے پس منظر ہی میں رکھا گیا ہے۔

سید مظہر جمیل نے فیض کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں پر بہت محنت سے کافی حوالوں سے مواد فراہم کیا ہے۔ ہر حوالے سے ضروری تفصیلات بھی فراہم کی گئی ہیں، فیض کے حوالے سے کتب کی فہرست بھی اس سوانح میں شامل ہے۔ یہ کتاب بھی آئندہ فیض شناسی کے حوالے سے مستند ذریعے کا درجہ رکھتی ہے۔

فیض کی جائے پیدائش کے حوالے سے اختلاف میں ڈاکٹر لدمیلا نے کالا قادر ، ڈاکٹر ایوب مرزا نے صرف سیالکوٹ میں پرورش کی بات لکھی ہے۔ اشفاق حسین نے "فیض احمد فیض– شخصیت اور فن" میں، خلیق انجم نے "فیض احمد فیض– تنقیدی جائزہ" میں، ڈاکٹر ایوب مرزا نے "فیض نامہ" میں اور سید تقی عابدی نے "فیض فہمی" میں فیض کا مولد کالا قادر ہی بتایا ہے لیکن ان سب کے مقابلے میں سید مظہر جمیل نے سیالکوٹ ہی کو جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ انھوں نے فیض کے انٹرویو کا حوالہ دیا ہے جس میں فیض نے اپنی جائے پیدائش سیالکوٹ بتائی ہے۔

فیض کی طبیعت میں ان کے والدین کی تربیت کا اثر بھی پتہ چلتا ہے اور ابتدائی حالات سے آئندہ کی طرف کافی رہنمائی ملتی ہے۔ ایک اعلیٰ شخصیت کا بردبار اور متحمل ہونا، دوسروں کی بات کو سننا اور منفی تنقید برداشت کرنا کس قدر متاثر کن ثابت ہوتا ہے۔ شخصیت اور فن کا ایک دوسرے پر اثر بھی ناگزیر ہے۔ فیض نے اپنے متقدمین سے اثر لیا اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ فیض کو زندگی میں تمام تر مشکلات اور مصائب اپنے دیس سے جبکہ بین الاقوامی سطح پر ہمیشہ عزت اور پذیرائی ملی ہے۔

اس مطالعے سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ صاحب سوانح نے ایک شاعر کی حیثیت سے دنیا بھر کی طرح اپنے ملک میں بھی نام کمایا مگر جہاں دنیا ان سے مستفید ہوئی، ملک پاکستان میں فیض کی شاعری کے ساتھ ان کے دیگر پہلوؤں سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا جس میں ان کی ڈرامہ نگاری، فلم اور ڈاکومینٹری کے حوالے

سے کام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کے بنائے منصوبے جن میں آرٹس کونسل کے لیے کام اور کلچر پر مواد پھر انٹرنیشنل یونیورسٹی آف ٹیکسلا کا منصوبہ پر توجہ دی جانی چاہیے تھی۔

فیض احمد فیض جیسے دانشوروں اور ادبی و علمی تحریکوں پر سیاسی رویوں کے شدید اثرات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ کس طرح سیاست اور حکومت کے عناں گیر ادب اور اس کے اثرات کو سبوتاژ کر دیتے ہیں۔ جتنے مشکل حالات ہوں گے اتنا ہی زیادہ مزاحم ادب تخلیق ہو گا۔

اردو زبان نہ صرف اردو دان طبقے میں اور اپنے ملک میں بلکہ دنیا بھر کے ممالک کے مظلوم اور پسے ہوئے عوام کی ترجمان ہو سکتی ہے۔ اس بات کا ثبوت فیض احمد فیض کی اپنے ملک اور زبان سے باہر بین الاقوامی سطح پر اردو اور تراجم کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فیض کی زندگی میں ان کی شریکِ حیات کی طرف سے ملنے والے حوصلے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کی گواہی ان کے ہر سوانح نگار سے ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علی احمد فاطمی، فیض ایک نیا مطالعہ، ادارہ نیا سفر، الٰہ آباد، ۲۰۱۲، ص ۱۲۹

۲۔ مظہر جمیل، سید، ذکرِ فیض، کراچی کلچرڈ یپارٹمنٹ، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۷۰

۳۔ لدمیلا وسیلئیوا، پرورشِ لوح و قلم: فیض حیات و تخلیقات، مترجمہ اسامہ فاروقی / لدمیلا وسیلیوا، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵

۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۲۰

۶۔ ایضاً، ص ۱۶

۷۔ ایضاً، ص ۵۱

۸۔ ایضاً، ص ۶۲

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶۰

۱۲۔ قراۃ العین حیدر، سرِ دوشبانہ، مشمولہ فکر و تحقیق، شمارہ ۲، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دلی، ۲۰۱۱ ص ۱۹

۱۳۔ مظہر جمیل، سید، ذکرِ فیض، ص ۸۰۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۸۸

۱۵۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷

۱۶۔ مظہر جمیل، سید، ذکرِ فیض، ص۲۸

۱۷۔ ایضاً، ص۳۸

۱۸۔ ایضاً، ص۴۴

۱۹۔ ایضاً، ص۱۵۲

۲۰۔ ایضاً، ص۲۲۱

۲۱۔ ایضاً، ص۱۱۷

۲۲۔ ایضاً، ص۲۷۷

۲۳۔ ایضاً، ص۳۲۳

۲۴۔ ایضاً، ص۱۱۴

۲۵۔ ایضاً، ص۳۸۲

۲۶۔ منو بھائی، ہم جیتے جی مصروف رہے، گریبان (کالم) مطبوعہ: روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۸اکتوبر، ۲۰۰۸ء

۲۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، ص۱۴۶

۲۸۔ ایضاً، ص۱۴۸

۲۹۔ مظہر جمیل، سید، ذکرِ فیض، ص۳۵

۳۰۔ ایضاً، ص۸۷

۳۱۔ ایضاً، ص۸۸

۳۲۔ ایضاً، ص۹۱

۳۳۔ ایضاً، ص۱۵۵

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۵۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۵۱

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۶۴

۳۷۔ لدمیلا وسیلئیوا، پرورشِ لوح و قلم: فیض حیات و تخلیقات، ص ۱۶۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۲۸

۳۹۔ ایضاً، ص ۸۵۰

۴۰۔ ایضاً، ص ۹۷۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۴۹۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۵۰۳

۴۳۔ ایضاً، ص ۵۰۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۷۲۰

۴۵۔ ایضاً، ص ۹۴۳

۴۶۔ ایضاً، ص ۹۵۱

۴۷۔ سحر انصاری، پروفیسر، فیض کے آس پاس، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶

باب چہارم

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

فیض احمد فیض اردو ادب میں نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر مقبول ترین شعراء کی فہرست میں ایک معتبر حیثیت رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کو سب سے زیادہ سراہا گیا اور ان سے متعلق لوگوں نے اپنے اپنے طور پر کسی نہ کسی پہلو سے لکھا یا کہا مگر ایک مستند اور جامع سوانح عمری کی کمی ہمیشہ سے محسوس کی جارہی تھی جس میں فیض کی شخصیت کے مکمل احاطے کی کوشش کی گئی ہو۔ ایسی سوانح جو سوانح نگاری کے فن پر پوری اترتی ہو۔ سوانح نگاری میں عقیدت سے زیادہ حقیقت کو پیش کرنا اس کے معیاری ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی اس میں سوانح نگار نے غیر جانبدار رہتے ہوئے صاحبِ سوانح کی ایسی درست تصویر کشی کی ہو کہ اس کی شخصیت مجروح ہوئے بغیر پوری طرح سامنے آجائے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جتنی بڑی شخصیت ہوتی ہے اتنی ہی اس کے متعلق قیاس آرائیوں کا ہالہ گہرا ہو جاتا ہے۔ فیض کی شخصیت ایسی ہی قد آور شخصیت تھی جن کے فن کے متعلق اور ذات کے بارے میں بہت زیادہ لکھا گیا لیکن اس کا بڑا حصہ کسی خاص مقصد کے تحت لکھی جانے والی تحریروں پر مشتمل تھا۔

فیض کی اہلیہ ایلس فیض نے ان کی زندگی میں ہی مرزا ظفر الحسن سے بارہا اس خواہش کا اظہار کیا مگر اس کی کوئی صورت نہ پیدا ہو سکی۔ بعد میں اجمالی طور پر انھوں نے "عمرِ گزشتہ کی کتاب" میں کچھ مواد پیش کیا ۔کچھ تو فیض کے خطوط سے اور کچھ مواد کچھ صہبا لکھنوی کے شائع کردہ فیض نمبر سے بھی ملتا ہے۔ فیض کے فن پر لکھنے والوں نے جی بھر کر لکھا اور انھی لوگوں میں سے بعض نے کچھ سوانحی کوائف بھی شامل کیے لیکن ان کی حیثیت محض معلوماتی سطح تک زیادہ رہی۔

فیض احمد فیض چونکہ زیادہ اہم حیثیت بطور شاعر ہی رکھتے تھے اور ان کے دیگر حوالے اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے اس لیے سب سے زیادہ فیض کی شاعری ہی کے حوالے سے کام ہوا۔ ان کے شاعرانہ کارناموں پر لکھنے والوں نے زیادہ تر توجہ ان کی شاعری کی فنی خوبیوں یا ان کے محاسنِ کلام پر زیادہ توجہ دی، اور اکثر و بیشتر ان کے کلام پر تنقیدی کتاب میں مختصراً سوانحی کوائف بھی شامل ہوتے ہیں۔

فیض احمد فیض کی سوانح عمری کی کمی ابتدا ہی سے محسوس کی جارہی تھی اور اس سلسلے میں ایلس فیض بھی کئی بار ذکر کر چکی تھیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے "فیض نامہ" اور "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کو سوانحی طرز پر تحریر کیا۔ جامعہ کراچی سے اشفاق حسین نے مقالہ "فیض اور ان کی شاعری" تحریر کیا۔ پہلی بار مختصر انداز میں اشفاق حسین نے "فیض، شخصیت اور فن" کی صورت میں سوانح اور فن کا امتزاج پیش کیا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریر کردہ سوانح کی اپنی حیثیت رہی ہے۔

انگریزی میں ایلس فیض نے "Over my Shoulders" ، فیض کے نواسے نے ان کی سوانح "Faiz, Love and Revolution" تحریر کی ہے۔

روسی زبان میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے "پرورشِ لوح و قلم" تحریر کی جو روسی طلبا کی تدریسی ضرورت کے تحت لکھی گئی، جس کی اشاعت روس میں ۲۰۰۲ء میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر لدمیلا کو اردو زبان و ادب پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے انھوں نے ساقی فاروقی کے انتقال کے بعد اس کا اردو ترجمہ کر کے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ کتاب فیض کے متعلق معتبر مواد کی پیشکش کا خیال رکھتے ہوئے تحریر کی گئی ہے۔ کتاب کے ہر باب میں ایک شعر سے دیا گیا ہے جس سے اس باب کی تفصیل کا کوئی باطنی ربط یا تعلق موجود ہے۔ پہلے باب سے آخری تک ایک تسلسل نظر آتا ہے۔

لدمیلا نے معروضی طریق کار کو بھی برتا ہے اور ساتھ ساتھ فیض کی ابتداء سے آخر تک فکر کو بھی ایک خاص طریقے سے پیش کیا ہے۔ سوانح کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں سوانح نگار کی اپنی ذات تبصرہ نگاری کی صورت میں حاوی نظر آتی ہے اس کے علاوہ کچھ نظموں اور اشعار کی تکرار بھی تھوڑی دیر کے لیے توجہ کا

تسلسل توڑ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کو ابواب میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ زمانی ترتیب کی بجائے کسی خاص پہلو کو شروع یا درمیان سے آخر تک بیان کیا گیا ہے۔ اس سوانح کے خاتمے کی طرف جاتے ہوئے قلم پر بھی اضمحلال کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ہر باب کے آخر میں مآخذ کے حوالہ جات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

اس طرح لدمیلا نے بہت حد تک ان معلومات کو مستند ذرائع سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں فیض کی زندگی کو آغاز سے ان کی وفات تک اور اپنے شہر سے دنیا بھر میں فیض کی مقبولیت پر کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔ فیض کے نظریات سے لیکر ان کے فن تک کی شرح، نجی زندگی سے بین الاقوامی امور تک بنیادی طور پر تقریباً ہر گوشے پر لدمیلا نے روشنی ڈالی ہے۔ فیض کی شاعری پر نہ صرف ماہرانہ تبصرہ ملتا ہے بلکہ فیض کی شاعری کے کچھ خاص پہلو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لدمیلا نے فیض کی شاعری میں غم اور رجائیت دونوں کے توازن کو تلاش کیا ہے۔ کتاب میں واقعات کی ترتیب اور تسلسل سے صاحب سوانح کی زندگی کا ایسا منظر نامہ سامنے آتا ہے کہ جس سے ان کے حالات کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی بھی بہت خوبصورتی سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا نے روسی زبان میں یہ سوانح تحریر کی تھی اور اس کا اردو ترجمہ بھی خود پیش کیا جس کی روانی اور ترسیل سے قطعی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ غیر ملکی شخصیت کی تحریر ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے "فیض نامہ" اور "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کو سوانحی طرز پر تحریر کیا۔ اس کتاب میں مکالماتی رنگ اختیار کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے کبھی فیض کی زبانی اور کبھی اپنے الفاظ میں سوال و جواب کی صورت میں فیض کے خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اگرچہ سوانحی حالات کو فیض کی زبانی بیان کروا کے کئی حوالوں سے معلومات قاری تک پہنچائی ہیں مگر ان کا جھکاؤ فیض کے نظریات اور فن کی طرف زیادہ رہا۔ فیض احمد فیض کی شخصیت پر بھی ڈاکٹر ایوب مرزا نے خود جہاں مناسب سمجھا اپنے الفاظ یا پھر فیض کی دونوں صاحبزادیوں کی زبانی فیض کے اخلاق و عادات کو مختصراً شامل کیا ہے۔ اس کتاب میں کسی زمانی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر محض سوال و جواب کا ایک سلسلہ جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریر کردہ یہ کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" فیض احمد فیض کے حوالے سے بہت سی معلومات لیے ہوئے ہے۔ فیض کے آباؤ اجداد اور ان کی اپنی زندگی کے کئی گوشے سامنے لانے کے ساتھ

فیض کے افکار و نظریات کا کافی واضح اظہار اس کتاب میں ملتا ہے۔ اگرچہ فنی طور پر اس کتاب نے سوانح نگاری کے اصولوں سے انحراف کیا ہے لیکن مکالموں کی صورت میں سوانح نگاری کا یہ روایت سے ہٹ کر تجربہ ہے۔ اس کتاب کا طرزِ بیان افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ صاحبِ سوانح سے ان کی زندگی کے دوران ہی معلومات اکٹھی کر کے شائع کرنے میں اس کتاب کے مواد کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

حالیہ برسوں میں سید مظہر جمیل کی تحریر کردہ سوانح "ذکرِ فیض" منظر عام پر آئی جس کو بجا طور پر جامع اور مستند سوانح کہا جا سکتا ہے۔ اس کو سید مظہر جمیل نے محکمہ ثقافت سیاحت و نوادرات، حکومت سندھ کے ایما پر مرتب کیا اور ۲۰۱۳ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس سوانح میں فیض کی زندگی کے ساتھ اس دور کی ادبی، سیاسی، معاشی سرگرمیوں کا بھی منظر نامہ سامنے آتا ہے اور اس طرح تفصیلی سیاق و سباق کے ساتھ فیض کی شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سوانح عمری میں فیض کی زندگی کے احوال پیدائش سے وفات تک ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ اور آخری باب میں فیض کے عالمی سطح پر تراجم اور ان کی پذیرائی کے احوال شامل کیے گئے ہیں۔

سید مظہر جمیل کے مطابق اس سوانح عمری کا نام "ذکرِ فیض" ان کی زندگی میں ہی طے ہو چکا تھا ۔کتاب کے آخر میں حواشی، کتب کی فہرست اور اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مندرجات کے حوالے اور ان کے ساتھ سوانح نگار کی رائے بھی شامل ہے۔ اسی سوانح میں ابتدا میں سوانح نگار نے دیگر فیض کی سوانحی تحریروں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق آرا بھی پیش کی ہیں۔ کتاب میں کہیں کہیں تفصیلات کی بہتات، طوالت اور بعض واقعات کی ایک سے زیادہ بار بازگشت بھی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ سوانح نگار نے فیض سے متعلق ہر ادارے اور ملکی و غیر ملکی حالات اور دیگر کی تفاصیل بھی پیش کی ہیں۔ اگرچہ اس سوانح کا بڑا حصہ اپنے پیش رو فیض کے ناقدین اور معتقدین کی تحریروں سے ملتا ہے۔ لیکن اس طرح اس تمام مواد کی جمع آوری اور اس کی پیشکش نے اس سوانح کی اہمیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ اور ایک سوانح عمری کی حیثیت سے اس کتاب کے مطالعے کے بعد صاحبِ سوانح کی زندگی سے متعلق تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا۔

کسی بھی ادبی تخلیق کو اس کے خالق سے الگ نہیں کیا جا سکتا جو کہ نہ چاہتے بھی اپنی ذات کے اثر سے تخلیق کو نہیں بچا سکتا۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کی جو سوانح "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" شائع کی جس کو فیض نے خود بھی دیکھا، صاحبِ سوانح متعلق کسی بھی حوالے سے اس کتاب سے رجوع کرنا فیض کی شخصیت اور خصوصاً ان کے نظریات کو سمجھنے کے لیے قابلِ قدر مواد فراہم کرنے کا ذریعہ رہے گا۔ طرزِ بیان کے حوالے سے اس کتاب میں سوانح نگاری کے رائج اصولوں سے ہٹ کر نئی طرح اختیار کی گئی ہے جو روایتی سوانح نگاری کے فن پر تو پوری طرح نہیں اترتی لیکن ایک نئے تجربے کے طور پر ضرور قابلِ توجہ ہے۔

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے جہاں ایک غیر ملکی سوانح نگار کی حیثیت سے جس طرح فیض کو پیش کیا اس طرح نہ صرف اردو اور پاکستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اور روسی زبان میں بھی فیض کی پذیرائی ان کے مقام اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

سید مظہر جمیل نے فیض کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں پر بہت محنت سے کافی حوالوں سے مواد فراہم کیا ہے۔ ہر حوالے سے ضروری تفصیلات بھی فراہم کی گئی ہیں، فیض کے حوالے سے کتب کی فہرست بھی اس سوانح میں شامل ہے۔ فیض کی سوانح عمریوں میں متذکرہ کتاب بھی آئندہ فیض شناسی کے حوالے سے مستند ذریعے کا درجہ رکھتی ہے۔

متذکرہ تینوں منتخب سوانح عمریوں کے تقابل سے فنِ سوانح نگاری کے اصولوں کے تحت ان کی معلومات اور طرزِ پیشکش کو پرکھنے سے اردو میں سوانح نگاری میں اور فیض شناسی کی روایت میں ان اہم کتب کے اشتراکات اور افتراقات سامنے آتے ہیں۔ ان سوانح عمریوں سے نہ صرف فیض احمد فیض کے ملکِ پاکستان میں اور اردو کے بین الاقوامی کردار سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اردو زبان و ادب اور ادیبوں کے حوالے سے کیا کیا پیش رفت ہو رہی ہے یا مستقبل میں کیا امکانات موجود ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج

اس مقالے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کی "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"، ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کی "پرورشِ لوح و قلم" اور سید مظہر جمیل کی "ذکرِ فیض" کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ سوانح کے فن کے بنیادی اصولوں یعنی استناد، غیر جانبداری اور اس کے ساتھ حسنِ ترتیب اور پیشکش کو مد نظر رکھتے ہوئے ان تینوں سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں کتب کی اپنی اپنی حیثیت ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کی زندگی کے دوران کتاب شائع کی، ڈاکٹر لدمیلا نے ایک غیر ملکی ادیبہ کی حیثیت سے فیض کو اپنے انداز میں پیش کیا اور ان کی وفات کے کئی برس بعد مظہر جمیل نے فیض کی سوانح شائع کی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے مکالموں، فیض کے خیالات اور اپنے تاثرات کو زیادہ جگہ دی ہے، اس کتاب میں چیدہ چیدہ سوانحی کوائف کو اکٹھا کر کے صاحبِ سوانح کی زبانی اور کچھ اپنے الفاظ میں قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو ایک سوانح سے زیادہ اپنے اسلوبِ بیان کی وجہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے قابلِ تعریف جگہ دی جاسکتی ہے۔ فیض کی موجودگی میں ان معلومات کا مجتمع ہو کر شائع ہونا اس کے مستند ہونے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس کی پیشکش میں ڈاکٹر ایوب مرزا کی اپنی شخصیت زیادہ حاوی نظر آتی ہے اور اپنے خیالات کے اظہار پر مبنی طویل عبارتیں، بے ربط واقعات اور کسی ترتیب کے بغیر معلومات کی پیشکش اس کتاب کو سوانح نگاری کے فن کے اصولوں سے دور کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر لدمیلا کی کتب سوانحی حالات کے ساتھ تاثراتی بھی ہے۔ اس کتاب میں بہت حد تک معیاری سوانح کے فنی تقاضوں کو بھی برتا گیا ہے۔ اس سے خاص طور پر بین الاقوامی سطح پر فیض احمد فیض اور اردو شاعری کا اثر اور دائرہ کار سامنے آتا ہے۔ اسی طرح سوانح نگار نے قاری کو اپنے ساتھ ساتھ فیض کے ہمراہ سفر کروانے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ "ذکرِ فیض" ضخامت اور مواد کے اعتبار سے جہاں بڑھ کر ہے وہاں سید مظہر جمیل نے فنِ سوانح نگاری کا معیار بھی برقرار رکھا ہے۔

اس کے علاوہ معلومات کی مقدار کی کمی بیشی کے علاوہ کوئی واضح تضاد کسی سوانح عمری میں نہیں ملتا۔ اگرچہ بعض اوقات طویل اقتباسات، تکرار اور تفصیلات بھی موجود ہیں لیکن آئندہ کے لیے فیض کی شخصیت کے حوالے سے گراں قدر معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ اردو میں دستیاب ہو گیا ہے جس میں فیض کی

شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہیں عام طور پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے اس کے علاوہ مستند ذرائع سے ایسا مواد بھی پیش کیا جو قبل ازیں ناقدین اور محققین کی توجہ کم حاصل کر سکا۔

ج۔ سفارشات

فیض کی انگریزی نظموں خصوصاً ایک طویل نظم "The Unicorn and The Dancing Girl" پر ترجمے اور تحقیق کا کام ہو سکتا ہے۔

فلم نگاری کے حوالے سے سکرپٹ وغیرہ، فیض کا پی ایچ ڈی کے مجوزہ مقالے، کلچر پر رپورٹس اور انٹرنیشنل یونی ورسٹی آف ٹیکسلا کے متعلق جو فیض احمد فیض نے منصوبہ سازی کی تھی، اس پر تجزیہ و تحقیق ہو سکتی ہے۔

فیض احمد فیض کے دیگر زبانوں میں ترجمہ شدہ کلام کا اور ان تراجم کے معیار کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

دیگر زبانوں خصوصاً انگریزی زبان میں موجود فیض کی سوانح عمریوں پر کام ہو سکتا ہے۔

ایلس کے تحریر کردہ خطوط "Dear Heart__Faiz" کو اردو میں منتقل کرنے اور اس پر تحقیقی کام کے امکانات موجود ہیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

ایوب مرزا، ڈاکٹر، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۱۹۷۹ء

لدمیلا وسیلئیوا، پرورشِ لوح و قلم: فیض حیات و تخلیقات، مترجمہ اسامہ فاروقی / لدمیلا وسیلیوا، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء،

مظہر جمیل، سید، ذکرِ فیض، کراچی کلچر ڈیپارٹمنٹ، کراچی، ۲۰۱۴ء

ثانوی مآخذ:

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

حالی، الطاف حسین، حیاتِ سعدی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طبع دوم، ۱۹۷۰ء

حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء

راشد فیصل، حالی کی سوانح نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء

رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، تفہیم و تجزیہ، کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹ء

سحر انصاری، پروفیسر، فیض کے آس پاس، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۱ء

سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک جائزہ، مترجم توحید احمد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

عبد اللہ، ڈاکٹر، سید، سر سید اور ان کے نامور رفقاء، لیتھو پریس، دہلی، ۱۹۶۰ء

عبد اللہ، ڈاکٹر، سید، وجہی سے عبد الحق تک، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۷ء

علی شاہ، ڈاکٹر، سید، اردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلیشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱ء

علی احمد فاطمی، فیض ایک نیا مطالعہ، ادارہ نیا سفر، الٰہ آباد، ۲۰۱۲ء

قراۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، جلد اول، مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء

گیان چند، ڈاکٹر، کھوج، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء

ماہنامہ افکار، فیض نمبر، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۶۵ء

ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء، رونق پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء

منو بھائی، ہم جیتے جی مصروف رہے، گریبان (کالم) مطبوعہ: روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۸ اکتوبر، ۲۰۰۸ء